زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

اگست ۲۰۱۷ء
۱۰؍ روپے

گوشۂ عصمت چغتائی

قاضی عبدالستار، شمیم حنفی

علی احمد فاطمی، صبیحہ انور

سلمان عبدالصمد، ندا موئید

نیر مسعود رتن سنگھ شہپر رسول

مہدی پرتاپ گڑھی طارق قمر

تبسم فاطمہ نفیس انصاری اوشا پریمودا

مخمور کاکوروی حیدر علوی پی پی شریواستو رند

سید آصف جاہ

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اردو ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش اور وفات (اگست)

ن م راشد

فراق گورکھپوری

عصمت چغتائی

خلیل الرحمٰن اعظمی

شکیل بدایونی

عبداللہ حسین

امداد امام اثر

شیخ ابراہیم ذوق

رشید جہاں

اختر انصاری

وحید اختر

فرید پربتی

صالحہ عابد حسین

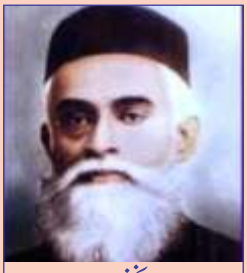
خدا بخش خاں

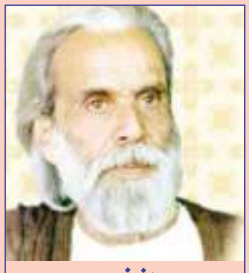
بشر نواز

ن م راشد	یکم اگست ۱۹۱۵ء	۹/اکتوبر ۱۹۷۵ء
عطیہ فیضی	یکم اگست ۱۸۷۷ء	۴/جنوری ۱۹۶۷ء
خدا بخش خاں	۲/اگست ۱۸۴۲ء	۳/اگست ۱۹۰۸ء
پرکاش فکری	۲/اگست ۱۹۳۱ء	۳۰/اکتوبر ۱۹۹۹ء
شکیل بدایونی	۳/اگست ۱۹۱۴ء	۲۰/اپریل ۱۹۷۰ء
شباب للت	۳/اگست ۱۹۳۳ء	۷/فروری ۲۰۱۴ء
فرید پربتی	۴/اگست ۱۹۶۱ء	۱۴/دسمبر ۲۰۱۱ء
بشیر الدین احمد	۴/اگست ۱۹۶۱ء	۲۴/اگست ۱۹۷۷ء
ابراہیم یوسف	۷/اگست ۱۹۲۱ء	۳۰/اکتوبر ۱۹۹۹ء
خلیل الرحمن اعظمی	۹/اگست ۱۹۲۷ء	یکم جون ۱۹۷۸ء

عصمت جاوید	۱۲/اگست ۱۹۲۲ء	۱۹/اگست ۲۰۰۲ء
وحید اختر	۱۲/اگست ۱۹۳۵ء	۱۳/دسمبر ۱۹۹۶ء
دیوان سنگھ مفتون	۱۴/اگست ۱۸۹۰ء	۲۶/جنوری ۱۹۷۵ء
محمد طفیل	۱۴/اگست ۱۹۲۳ء	۵/جولائی ۱۹۸۶ء
دیویندر اسر	۱۴/اگست ۱۹۲۸ء	۶/جومبر ۲۰۱۲ء
وقار عظیم	۱۵/اگست ۱۹۱۰ء	۱۷/نومبر ۱۹۷۶ء
اختر انصاری	۱۵/اگست ۱۹۲۰ء	۱۸/اگست ۱۹۸۵ء
عبداللہ حسین	۱۴/اگست ۱۹۳۱ء	۴/جولائی ۲۰۱۵ء
شکیلہ اختر	۱۶/اگست ۱۹۱۶ء	۹/فروری ۱۹۹۴ء
امداد امام اثر	۱۷/اگست ۱۸۴۹ء	۱۷/اکتوبر ۱۹۳۴ء

بشر نواز	۱۸/اگست ۱۹۳۵ء	۹/جولائی ۲۰۱۵ء
صالحہ عابد حسین	۱۸/اگست ۱۹۱۳ء	۸/جنوری ۱۹۸۸ء
اختر اورینوی	۱۹/اگست ۱۹۱۰ء	۳۱/مارچ ۱۹۷۷ء
عبدالقادر سروری	۱۹/اگست ۱۹۰۶ء	۱۱/مارچ ۱۹۷۱ء
عصمت چغتائی	۲۱/اگست ۱۹۱۵ء	۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء
ابراہیم جلیس	۲۲/اگست ۱۹۲۴ء	۲۶/اکتوبر ۱۹۷۷ء
شیخ ابراہیم ذوق	۲۲/اگست ۱۷۹۰ء	۱۶/نومبر ۱۸۵۴ء
ادا جعفری	۲۲/اگست ۱۹۲۴ء	۲۱/مارچ ۲۰۱۵ء
رشید جہاں	۲۵/اگست ۱۹۰۵ء	۲۹/جولائی ۱۹۵۲ء
فراق گورکھپوری	۲۸/اگست ۱۸۹۶ء	۳/مارچ ۱۹۸۲ء

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۵

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

اگست ۲۰۱۷ء

پبلشر: انج کمار جھا
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش
ایڈوائزر
ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی
ایڈیٹر
سہیل وحید
فون: 9415007694
Ph. No. 2239132 Ext. 115
Email:
nayadaurmonthly@gmail.com
تزئین کار : وقار حسین
کور: بشکریہ صبیحہ انور
مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش
زرِسالانہ : ایک سو دس روپے
فی شمارہ : دس روپے
ترسیل زر کا پتہ
ڈائرکٹر
انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001
Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow
خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱
بذریعۂ رجسٹری:
ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ
پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

عنوانات

اداریہ
اپنی بات ..... ایڈیٹر ۲

جشن آزادی
اگست آیا ..... مہدی پرتاپ گڑھی ۳
قطعات آزادی ..... ڈاکٹر محمود کاکوری ۴
تحریک آزادی اور اردو خطوط ..... ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری ۵
مجاہد آزادی کرنل نظام الدین ..... محمد رضا ۹

خراج تحسین
نیر مسعود سے گفتگو ..... سہیل وحید ۲۲

گوشۂ عصمت چغتائی
ذہین تیز آنکھوں والی عصمت آپا ..... قاضی عبدالستار ۲۸
پروفیسر شمیم حنفی سے انٹرویو ..... سہیل وحید ۲۹
عصمت چغتائی عرف لیڈی چنگیز خاں ..... پروفیسر علی احمد فاطمی ۳۱
عصمت چغتائی کا فن ..... ڈاکٹر صبیحہ انور ۳۷
عصمت چغتائی کے افسانوں میں ضعیف عورتیں ..... ندا موئید ۳۹
عصمت چغتائی کی لکھنؤ آمد: یادیں اور ملاقاتیں ..... ڈاکٹر صبیحہ انور ۴۱
عصمت کے فکشن میں مماثل عناصر ..... سلمان عبدالصمد ۴۸
ٹیڑھی لکیر (اقتباس) ..... عصمت چغتائی ۵۲
کاغذی ہے پیرہن (اقتباس) ..... عصمت چغتائی ۵۶

افسانے
پانی پر تیرتی کہانی ..... رتن سنگھ ۵۹
لافنگ بدھا ..... تبسم فاطمہ ۶۰
ٹوٹی ہوئی لڑیاں ..... نفیس انصاری ۴۵

گزشتہ لکھنؤ
امراو شرفا کی مشترک خصوصیات ..... مرزا جعفر حسین ۶۸

ہندی کہانی
میاں ..... ہری اوم ۷۲

ہندوستانی زبانیں
ایندھن (چوتھی قسط) ..... حمید دلوائی ۷۷

غیر ملکی ادب
دیارِ غربت ..... گوائے ڈی موپاسا ۸۰

غزلیں و نظمیں
رباب رشیدی، پروفیسر شہپر رسول ۱۳
اختر شاہجہانپوری، مدہوش بلگرامی ۱۵
الیاس چشتی، ڈاکٹر کیفی سنبھلی ۱۷
سید آصف جاہ ۱۹
ڈاکٹر سید ظفر اکبر الٰہ آبادی، حیدر علوی ۱۴
رہبر سلطانی، پی پی شریواستو رند ۱۶
ڈاکٹر طارق قمر ۱۸
جلیس نجیب آبادی، اظہار وارثی ۲۰

ترقیات
حکومت اتر پردیش؛ عوام کے اعتماد کی ضامن ۸۴

نقد و تبصرہ
مثنوی کرب جاں ..... غضنفر ..... پروفیسر انیس اشفاق ۸۶
وصف پیغمبری نہ مانگ ..... شائستہ فاخری ..... محمد وصی اللہ حسینی ۸۷

خطوط
آپ کے خطوط ۸۸

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

قارئین 'نیا دور' کو یوم آزادی کی مبارکباد۔ ہندوستان کے ایک نئے عہد میں داخل ہونے کی خوش آئند خبروں کے درمیان 'نیا دور' کا یہ شمارہ حاضر ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس شمارے میں کچھ ایسا ضرور رہے جو قارئین کے علمی و ادبی ذوق پر کھرا اترے۔

اردو افسانے کو ایک نیا رنگ، نیا ڈکشن، نیا پس منظر اور نیا پیراہن عطا کرنے والی معروف افسانہ نگار

'نیا دور' کے بیحد اصرار پر جدید دور کے مشہور شاعر اور فلمی دنیا کے معروف نغمہ نگار ندا فاضلی کی شریک حیات محترمہ مالتی جوشی نے ندا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لکھنے کی حامی بھر لی ہے۔ جلد ہی 'نیا دور' کے شمارے میں محترمہ مالتی جوشی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

عصمت چغتائی پر ایک مختصر لیکن بھرپور گوشہ شائع کرنے میں ہم کامیاب ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام پروفیسر قاضی عبد الستار اور پروفیسر شمیم حنفی صاحب کی پرخلوص معاونت کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ قاضی صاحب نے ہماری گزارش کے مطابق عصمت آپا سے متعلق اپنی یادوں سے نوازا۔ شمیم حنفی صاحب کے بھی ہم بیحد مشکور ہیں کہ انہوں نے ہم سے عصمت آپا سے متعلق گفتگو کی۔ لیکن ہم سب سے زیادہ مشکور ڈاکٹر صبیحہ انور کے ہیں جنہوں نے اپنی بیرونی مصروفیت کے باوجود عصمت آپا کے ساتھ لکھنؤ میں گزارے ہوئے اپنے ان لمحوں کا ذکر خصوصی طور پر کیا۔ ماضی قریب میں عصمت چغتائی جب بھی لکھنؤ آئیں، کوئی نہ کوئی محفل میں شامل ہوئیں یا محفل منعقد ہوگئی۔ ان محفلوں کے قصے اور ان واقعات کو صبیحہ آپا نے جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے، اس سے 'نیا دور' کے قارئین یقیناً محظوظ ہوں گے۔ صبیحہ آپا نے ایسی نادر تصاویر بھی 'نیا دور' کو مہیا کرائیں جو سب کے سب لکھنؤ کی ہیں اور بیحد اہم ہیں۔

عصمت چغتائی نے مسلم متوسط طبقہ کی لڑکیوں اور عورتوں کے کرداروں کو جس خوبصورتی سے اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے، اس کی تعریف تو توصیف تو خوب ہوئی لیکن ان کے افسانوں اور ناولوں میں ضعیف کرداروں پر شاید پہلی مرتبہ 'نیا دور' کے لئے ندا موئید نے لکھا ہے۔ 'کاغذی ہے پیرہن' کے بغیر عصمت چغتائی پر کوئی بات بنتی نہیں ہے۔ اس لئے اس کا بھی ایک اقتباس گوشہ میں شامل ہے۔ 'ٹیڑھی لکیر' کے اقتباس کے بغیر بھی یہ گوشہ مکمل نہ ہوتا، سو وہ بھی شامل ہے۔ غالباً پہلی مرتبہ کوئی نظمیہ کہانی نیا دور کی زینت بن رہی ہے۔ یہ کہانی بزرگ افسانہ نگار رتن سنگھ صاحب کی ہے۔ نظمیہ کہانی کا تجربہ اردو ادب کے لئے بہت پرانا نہیں ہے۔ اس قسم کی کہانی لکھنے کا عمل اردو میں اس سے پہلے نا کے برابر ہوا ہے۔ اس کہانی پر 'نیا دور' کے قارئین کی رائے کا ہمیں شدت سے انتظار رہے گا۔

'نیا دور' کے نئے رنگ و آہنگ کا یہ چوتھا شمارہ آپ جب بھی پڑھیں تو اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ 'نیا دور' کی کامیابی اسی بات میں مضمر ہے کہ اس کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو۔ یہ ایک چھوٹی سی گزارش ہے، ایک حقیری استدعا ہے کہ آپ سب اردو کے تئیں اپنی ذمہ داری کا نباہ کرتے ہوئے 'نیا دور' کی ممبر شپ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کریں۔ 'نیا دور' کے جتنے زیادہ قارئین ہوں گے، اردو ادب اور زبان کا دائرہ اتنا ہی زیادہ وسیع ہوگا۔ ہم بھرپور کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اس محبوب رسالے کو زیادہ سے زیادہ تخلیقی مواد سے مزین کر سکیں۔ اس میں ہم کتنے کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔

جولائی کے شمارے میں شائع ہونے والی تمام تخلیقی نگارشات کے تخلیق کاروں کے قلمی تعاون کے لئے ہم شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ماہنامہ 'نیا دور' کے اس جدید رنگ و آہنگ کو ایک سمت و رفتار عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے معاصر تخلیق کار اس ادبی مسافت میں ہماری استعانت کرتے رہیں گے۔

ہم جلد ہی 'نیا دور' کو عالمی سطح پر نیا دور کی نئی شناخت قائم کرنے اور اس کے ای ایڈیشن کو بھی شروع کرنے کی

مقبولیت کی بلندیوں کو سر کرنے والے عہد جدید کے مشہور شاعر بشیر بدر گزشتہ کافی عرصہ سے بستر علالت پر ہیں۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ جلد ہی ہم ان پر بھی ایک گوشہ شائع کریں گے۔ بشیر بدر کی علالت اور ان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں ان کی اہلیہ سے گفتگو بھی اس میں شامل ہوگی۔

کوشش کریں گے تاکہ دوسرے ممالک میں موجود زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں تک ہم رسائی حاصل کر سکیں۔ فی الحال information.up.nic.in پر 'نیا دور' کے شمارے دستیاب ہیں۔

سہیل وحید

اگست آیا

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸؍اسکول وارڈ، پرتاپ گڑھ
موبائل: 9005003950

پیام جشن بہار لے کر اگست آیا
فضاؤں میں نغمۂ مسرت سے کیف چھایا
ہر ایک لب پر ہے گیت آزادئ وطن کا
ہے ملک آزاد، خوں شہیدوں کا رنگ لایا

صبا نے ہنس کر لیا ہے بوسہ کلی کلی کا
گلوں نے عارض پہ خوشبوؤں کا گلال چھڑکا
ہر ایک دل میں ہیں جاگ اٹھیں نئی امیدیں
ہر ایک انساں کی آنکھ میں رنگین خواب جاگا

ہمارا ماضی تو تھا عبارت اداسیوں سے
ہزاروں محرومیاں در آئی تھیں زندگی میں
جما لیا تھا تسلط اپنا سپاہیوں نے
وطن کی عظمت لٹی تھی سورج کی روشنی میں

ہوا ہے سب کی مگر تھا نہ اس پہ حق ہمارا
ہے پانی سب کا مگر ہمارے لئے نہیں تھا
ہے دھوپ سب کی مگر نہ تھی دسترس میں اپنے
کبھی تھا ان نعمتوں پہ دعویٰ فرنگیوں کا

بڑھے مظالم تو کچھ جیالے بھی جاگ اٹھے
مقابل آئے ہتھیلیوں پہ سر اپنا لے کر
فرنگیوں سے بالآخر ہم نے نجات پائی
اگست آیا بدل گیا اس چمن کا منظر

اگست لایا ہے اک بشارت نئی رتوں کی
مٹا کے کرب حیات آگے قدم بڑھائیں
اک عزم تازہ کے ساتھ بابِ حیات کھولیں
اٹھیں، چلیں، بزم امکاں کو ہم سجائیں

مسرت ایک ایک گھر میں جاگے یہ آرزو ہو
کبھی بھی نکبت نہ سر اٹھائے یہ آرزو ہو
ہم اب نگہ دار ہیں وطن کے کبھی نہ بھولیں
بری نظر اس طرف نہ اٹھّے یہ آرزو ہو

ہماری آزادی خوب نکھرے، دعائیں مانگیں
چمن کا ہر غنچہ مسکرائے دعائیں مانگیں
بہار پھولوں میں رنگ بھر دے دعائیں مانگیں
جہاں میں بھارت کا نام چمکے دعائیں مانگیں

ہو دور امن اور آشتی کا دعائیں مانگیں
نہ ڈالے ادبار اپنا سایا دعائیں مانگیں
ہماری پوری ہو یہ تمنا دعائیں مانگیں
کرے رشک اس چمن پہ دنیا دعائیں مانگیں

وقارِ آزادئ وطن کے ہیں پاسباں ہم
ہمیشہ محرابِ آشتی سے کہیں اذاں ہم
مثالی انساں بنیں وطن میں رہیں جہاں ہم
خدا کی بستی میں بن سکیں میرِ کارواں ہم

قطعاتِ آزادی

ڈاکٹر مخمور کاکوروی
68، چودھری محلہ، کاکوری، لکھنؤ
موبائل: 9450097929

شہیدوں کو سلام

وہ جن کا دار و رسن احترام کرتے ہیں
جو اپنی جان وطن تیرے نام کرتے ہیں
زمانہ جن کو فراموش کر نہیں سکتا
ہم اُن شہیدوں کو جھک کر سلام کرتے ہیں

چراغِ آزادی

وہ لہڑی ہوں کہ بھگت سنگھ کہ بسمل و اشفاق
انہی کے دم سے ہے شاداب باغِ آزادی
وطن کو جب دیا اپنا لہو شہیدوں نے
جلا ہے تب کہیں جا کر چراغِ آزادی

تاریخ آزادی

غلط ہے صرف مال و زر دیا اشفاق و بسمل نے
ضرورت جب پڑی تو سر دیا اشفاق و بسمل نے
لکھی مخمور اپنے خون سے تاریخ آزادی
وطن کا نام روشن کر دیا اشفاق و بسمل نے

مقامِ آزادی

وہ کیسے سمجھے گا کیا ہے مقامِ آزادی
لہو نہ جس نے دیا ہو بنامِ آزادی
نظر نہ آئے گی اب تیرگی غلامی کی
ہمارے خون سے روشن ہے شامِ آزادی

حق کا سر

دل و جاں دے دئے، گھر دے دیا راجندر لہڑی نے
وطن کے نام پر سر دے دیا راجندر لہڑی نے
درِ باطل پہ حق کا سر کبھی جھکتا نہیں ظالم
سبق یہ زیرِ خنجر دے دیا راجندر لہڑی نے

تاریخ ہند

تاریخِ ہند ہم نے لکھی اپنے خون سے
دامن ہے صاف، داغ نہ اس پر لگایئے
غدّار ہم کو کہنا تو آسان ہے مگر
اک بار اپنے روبرو آئینہ لایئے

برسرِ پیکار

تاریکیوں سے بر سرِ پیکار کون تھا
روشن چراغِ طاقِ سرِ دار کون تھا
کس نے لہو میں ڈوب کے درسِ وفا دیا
تاریخ خود گواہ ہے غدّار کون تھا

تحریک آزادی اور اردو خطوط

ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری
اسسٹنٹ پروفیسر ساکھن لال چترویدی گرلس پی جی کالج کھنڈوہ (ایم پی)
موبائل: 9753210869

انگریزوں کی غلامی سے ہمارے ملک کو آزادی دلانے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اور تحریکیں چلائی گئیں وہ ہماری تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج ہیں۔ ملک کی آزادی کی خاطر جہاں رہنماؤں، قائدوں اور جیالوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی وہیں عام لوگ بھی پیچھے نہیں رہے۔ معمولی سے معمولی افراد نے اپنے ملک کی خاطر مزاحمتوں اور مہموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور طرح طرح کی تکلیفیں، اذیتیں اور زحمتیں بخوشی قبول کیں۔ یہ جہد و کوشش ایک صدی سے زائد عرصہ پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی عوام نے نسل در نسل اپنی زندگی آزمائشوں میں گزاری، ذہنی و جسمانی تکلیف سہی اور بالآخر ملک کو آزادی دلا کر ہی دم لیا۔

اپنی لیاقت، منصب و مرتبہ اور حیثیت کے مطابق تمام شعبوں سے وابستہ افراد نے اپنے اپنے طور پر اس سرزمین کے لئے کوششیں کیں۔ باشعور اور تعلیم یافتہ افراد نے جہاں جلسہ و جلوس اور احتجاج کے ذریعہ اپنی بے چینی کا اظہار کیا، وہیں انگریز مخالف مواد پر مشتمل تخلیقات، کتب و رسائل اور اخبارات کی اشاعت بھی کی۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کی اس تحریک میں پریس اور قلم کا غیر معمولی تعاون شامل ہے۔ صرف یہی نہیں اگر باریکی سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تحریک آزادی میں اشتہارات، نعرے، تحریری اطلاعات، چٹھی اور خطوط وغیرہ سے بھی بہت مدد ملی۔ جہاں شاعروں اور ادیبوں نے شاعری اور نثر میں آزادی کے گیت گائے، صحافیوں اور ناشروں نے اپنے اخبارات و رسائل کے ذریعہ عوام کا خون گرمایا وہیں پیغام رسانی اور خط و کتابت نے بھی ملک کو آزاد کرانے میں اہم رول ادا کیا۔

اس ضمن میں میں قارئین کی توجہ خطوط و مکاتیب کی طرف بطور خاص دلانا چاہتا ہوں، یعنی ملک بھر میں آزادی کی فضا ہموار کرنے میں دیگر وسائل کی طرح خطوط نے بھی نمایاں رول ادا کیا ہے۔ پچھلے زمانے میں پیغام پہنچانے کے لئے خطوط ایک اہم وسیلہ تھے، نہ صرف پڑھے لکھے بلکہ ان پڑھ اور معمولی افراد بھی اپنے حالات مثلاً خوشی و غم، مصائب و مشکلات، بے چینی، ناگریز اطلاعات اور اپنے علاقہ کی صورتِ حال کو اپنے خطوط میں بجا طور پر بیان کیا کرتے۔ ساتھ ہی اپنے آس پاس ہو رہے ظلم و ستم، خون خرابے اور ہندوستانی مجاہدین کی انتقامی سرگرمیوں کی اطلاع بھی اپنے خطوط میں ضرور تحریر کرتے۔ ملک کی آزادی کے لئے سرگرداں مجاہدین اور باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث افراد نے خود جہاں نظم و نثر، صحافیانہ مضامین اور خبروں کی اشاعت کے ذریعہ انگریزوں کی ذلیل حرکتوں کو بے نقاب کیا وہیں اپنی سرگرمیوں سے متعلق راز و نیاز کی باتیں اور اپنے پیغامات دور دراز رہنے والے اپنے ساتھیوں، ہمنواؤں اور رشتہ داروں کو خط و کتابت کے ذریعہ سے واقف کرایا۔

> اپنی لیاقت، منصب و مرتبہ اور حیثیت کے مطابق تمام شعبوں سے وابستہ افراد نے اپنے اپنے طور پر اس سرزمین کے لئے کوششیں کیں۔ باشعور اور تعلیم یافتہ افراد نے جہاں جلسہ و جلوس اور احتجاج کے ذریعہ اپنی بے چینی کا اظہار کیا، وہیں انگریز مخالف مواد پر مشتمل تخلیقات، کتب و رسائل اور اخبارات کی اشاعت بھی کی۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ آزادی کی اس تحریک میں پریس اور قلم کا غیر معمولی تعاون شامل ہے۔ صرف یہی نہیں اگر باریکی سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تحریک آزادی میں اشتہارات، نعرے، تحریری اطلاعات، چٹھی اور خطوط وغیرہ سے بھی بہت مدد ملی۔

ان خطوط میں نہ صرف اپنے انفرادی حالات و کیفیات کی اطلاع دی بلکہ اپنے محلے، علاقہ اور شہر کی صورت حال سے بھی واقف کرایا۔

ہنگامی حالات میں بارہا ایسا ہوتا کہ لوگوں کا گھر سے نکلنا مشکل ہوتا اور علاقہ میں کرفیو لگا دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے لوگ اپنی روزمرہ اور لازمی بنیادی ضروریات بھی پورا کرنے سے محروم ہو جاتے۔ علاوہ ازیں کبھی کبھی ایسی نوبت آتی کہ انگریز مخالفت اور باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث افراد کو گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ اپنے متعلق اطلاعات نیز اپنی خبر دوسروں تک پہنچانے کے لئے خطوط اور بند چٹھیوں کا سہارا لیتے، اپنی منشاء کاغذ اور کپڑوں وغیرہ پر لکھ کر بھیجتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اپنے پیغام کو خفیہ رکھنے کی خاطر تحریر میں اشاروں، کنایوں اور علامتوں کا استعمال

کرتے تاکہ اگر کوئی اس خط کو کھول کر پڑھنا بھی چاہے یا یہ خط انگریز افسران کے ہاتھ لگ جائے تو وہ بھی اسے سمجھ نہ پائیں۔ اس طرح تحریر کردہ اطلاعات صیغۂ راز میں رہتیں اور انقلابیوں کی کوشش اور سرگرمیوں کا پردہ فاش نہ ہوتا۔

غرض یہ کہ جب ہم جد و جہد آزادی کی پوری تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ آزادی کی لڑائی جن اہم ہتھیاروں سے لڑی گئی ان میں ایک خطوط کا بھی اہم حصہ ہے۔ انگریز حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے سلسلہ میں ابتدا سے لے کر صبح آزادی تک بے شمار خطوط لکھے گئے جن میں آزادیٔ وطن کی چنگاریاں موجود ہیں۔

انیسویں صدی عیسیوی کی ابتدا سے ہی انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں میں بے چینی اور غم و غصہ کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی۔ جس کے باعث باشعور افراد جابجا اس کا اظہار کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں علمائے دین کے ایک گروہ نے مذہبی تبلیغ، معاشرتی اصلاح اور فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھایا۔ اس کی ابتدا اگر چہ حضرت شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۳ء) نے کی۔ بعد ازاں اس فکر کے مبلغوں میں شاہ عبد العزیز (۱۷۴۶ء۔ ۱۸۲۴ء) اور سید احمد بریلوی (م ۱۸۳۱ء) وغیرہ سرگرم رکن کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس مذہبی تحریک کا ذکر تاریخ میں وہابی تحریک یا ولی اللّٰہی تحریک کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ تحریک محض مذہبی نہیں بلکہ سیاسی و سماجی بھی تھی۔ اس سے منسلک علمائے دین نے انگریزوں کی مخالفت میں بھی نمایاں کوششیں کیں۔ اپنے طلباء اور شاگردوں نیز ہم خیال افراد کے دل میں انقلابی جذبہ بیدار کرنے کے لئے اپنے جلسوں اور محفلوں میں تقریریں کیں۔ ساتھ ہی انگریزی حکومت کے ظلم و ستم کا اپنی تحریروں میں بھی تذکرہ کیا۔

وہابی تحریک سے وابستہ اشخاص نے جہاں اپنی تحریک کردہ کتابوں اور مضامین میں عوام کو بیدار ہونے کی ترغیب دی وہیں اپنے خطوط میں بھی اپنی اس فکر کا اظہار کیا۔ ملک کو آزاد کرانے کی جد و جہد یہیں سے شروع ہوگئی تھی۔ اس ضمن میں اخلاق حسین عارفؔ، خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر ابن کنول نے اپنے مضامین میں ان خطوط کے اقتباسات پیش کئے ہیں جو سید احمد بریلوی نے انیسویں صدی میں قابل ذکر امراء و حکماء میں شمار راجہ ہندو رائے، بدھ سنگھ اور دولت راؤ سندھیا وغیرہ کو تحریر کیا تھا۔ مثلاً خط کا اقتباس دیکھئے جو سید احمد بریلوی نے راجہ ہندو رائے کو لکھا ہے:

'خدا گواہ ہے کہ ہمارا منشاء اس زمین کو فرنگیوں سے آزاد کرانا ہے اور بس اور یہ اس لئے کہ تقاضائے مذہب یہی ہے اور اسی میں رضائے مولیٰ متصور ہے۔'

(خواجہ احمد فاروقی، اردو میں وہابی ادب، سہ ماہی نوائے ادب، ممبئی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۹)

اسی طرح دولت راؤ سندھیا کو لکھے خط میں کہتے ہیں:

'جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ اس لئے چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بار آور ہوں گی، حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہیں۔

(ابن کنول، اردو نثر اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ماہنامہ ایوان اردو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۴)

خط کے اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے لوگ آزادی کی جد و جہد کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر کرتے تھے اور ملک کو آزادی دلانے میں انہیں خدا کی خوشنودی دکھائی دیتی تھی۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی بعد کا واقعہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے برسوں پہلے یہ خطوط اس وقت لکھے گئے جب خطوط غالب وجود میں نہیں آئے تھے بلکہ مرزا غالبؔ عہد طفلی میں ہی رہے ہوں۔ یہیں سے مذہبی بزرگوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کا علم بلند کر دیا تھا۔

جس طرح مرزا غالب نے اپنے مکتوبات میں دہلی کی بربادی کا احوال بیان کیا ہے، اسی طرح رجب علی بیگ سرورؔ نے اپنے خطوط میں لکھنؤ کی تباہ حالی کا ذکر کیا ہے۔

'حضرت کے قدموں سے چھٹ گئے، بستی میں اجڑے لٹ گئے، تقدیر برگشتہ ہوئی، تمام رات اپنے دنوں کو روتے ہیں، ایسے سانحے دنیا میں کم ہوتے ہیں، قبلۂ عالم کی برکت سے شہر غیرت گلزار تھا، گلی کوچہ رشک باغ سراپا بہار تھا۔ اب سنسان، ہو کا

'جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ اس لئے چند غریب اور بے سروسامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بار آور ہوں گی، حکومت کے عہدے اور منصب ان کے سپرد ہوں گے جو اس کے مستحق ہیں۔

مکان ہوگیا۔ ایسا بسا بسایا نگر ویران ہوگیا، وہ قیصر و ایوان خجالت دہ جناں، قیصر سے جس کے دربار تھے، زیر آسماں بروئے زمیں اس جھمکڑے سے اور کہاں تھے۔ کیوں کر سینے میں سانس برچھی کا کام نہ کرے، جب اس میں خوگیر کی بھرتی بھرے، ہما نے منھ پھیرا، نحوست نے گھیرا، مسکن زاغ بوم ہوا، طاقوں میں طوطے، کارنسوں پر کوے، منڈیروں پر مینا، برجوں میں ابابیل، چھت پر چیلیں ہیں، ویرانے پن کی دلیلیں ہیں۔'

(ابن کنول، اردو نثر اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ماہنامہ ایوان اردو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۵)

پروفیسر ابن کنول تصنیف 'لکھنؤ اور جنگ آزادی، ص ۱۸۸۔۱۲۰' کے حوالے سے، سرورؔ کے ایک اور خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں:

'افسوس لکھنؤ سا شہر اس بے کیفیتی سے لٹ جائے، والی ملک جس نے خشکے کا پیڑ نہیں دیکھا ہو، اس فصل میں غریب الدیار ہو، اپنے بیگانے سے چھٹ جائے، دھوپ کا تڑاقا، لوں کا چلنا، زمین و آسمان کا جلنا، ہوا، آتش بار ہو، دخانی بجرہ نمونۂ کرۂ نار ہو۔'

(ابن کنول، اردو نثر اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ماہنامہ ایوان اردو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۵)

سرور کی طرح مرزا غالب نے بھی انقلاب ۱۸۵۷ء کا مشاہدہ بڑی باریکی سے کیا اور اپنے خطوط اور تحریروں میں شہر دہلی کے چشم دید حالات رقم کئے۔ انگریزوں کے خلاف انہوں نے باغیانہ سرگرمیوں میں حصہ نہ لیا مگر اپنی شاعری، نثر اور خطوط میں ان کا ذکر بخوبی کیا۔ مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط میں حالات غدر اور دہلی کی تباہی کا تذکرہ اس انداز سے کیا جس کی بنا پر کہا جانے لگا کہ خطوطِ غالبؔ سے زمانۂ انقلاب کی پوری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ان خطوط میں غالبؔ براہ راست انگریزی حکومت کی مخالفت اور کھل کر علم بغاوت بلند کرنے کا اظہار نہ کر سکے مگر ہندوستانیوں کے غم میں ان کا قلم برابر اشک باری کرتا رہا۔ غالبؔ نے اپنے متعدد خطوط میں جا بجا حسرت و یاس کا مظاہرہ کیا اور اپنے وطن کے لٹنے پر جس پُرخلوص جذبے کا اظہار کیا آگے چل کر اسی کو جذبۂ آزادیٔ وطن کا نام دیا گیا۔ اپنے چند مصاحبین کو لکھے خطوط میں غالبؔ نے فرنگیوں کی خونریزی اور بربریت کی داستان سنائی ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

'اے بندۂ خدا، اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے، کیمپ ہے، چھاؤنی ہے، نہ قلعہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔'

(ابن کنول، اردو نثر اور انقلاب ۱۸۵۷ء، ماہنامہ ایوان اردو، نئی دہلی، فروری ۲۰۰۹ء، ص ۱۵)

اسی طرح تحریک خلافت کی ابتدا ۱۹۱۹ء میں علمائے فرنگی محلی کے ذریعہ ہوئی۔ بعدازاں بی اماں اور علی برادران اس کے سرگرم اور فعال رکن کے طور پر ابھرے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے صحافت اور شاعری کے ذریعہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان کے اشعار نہ صرف اپنے زمانے میں زبانزد خاص و عام ہوئے بلکہ آج بھی انہیں اسی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہرؔ کے تحریر و خطبات اور تقریروں کے ساتھ ساتھ رقعات اور خطوط میں بھی بطور خاص جذبۂ آزادی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں علمائے دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے ہم خیال علماء و رفقاء کے درمیان ۱۹۱۳ء میں انگریزی سلطنت سے ہندوستان کو آزادی دلانے کے مقصد سے خط و کتابت کے ذریعہ ایک خفیہ مہم شروع کی۔ اس تحریک سے منسلک افراد انگریزوں کے خلاف اپنا منصوبہ، لائحۂ عمل اور پیغامات ایک دوسرے کو ریشم کے رومال پر تحریر کر کے ارسال کرتے تھے تاکہ حکومت وقت اور اس کے کارندوں کو اس خفیہ مشن کی سرگرمیوں کا علم نہ ہو سکے۔ اسی تحریک کو ریشمی رومال تحریک کہا گیا۔ یہ مشن اگرچہ طویل عرصہ تک پردۂ خفا میں نہ رہ سکا اور جلد ہی کسی انگریز نواز ساتھی کے سبب راز فاش ہوگیا، خطوط پکڑے گئے اور اس کام میں ملوث حکومت مخالف علماء کو گرفتار کرلیا گیا۔ باوجود اس کے ان کا حوصلہ نہیں ٹوٹا اور قید سے رہائی کے بعد بھی یہ علماء ہندوستان کی حصول آزادی کی جدوجہد میں سرگرداں رہے۔ ریشمی رومال تحریک کا سب سے طاقتور ہتھیار بھی خطوط ہی تھے۔ بس اتنا ہے کہ ان خطوط کو ریشم کے رومال پر تحریر کیا جاتا تھا۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جنگ آزادی میں تحریک ریشمی رومال کا جس قدر حصہ ہے اسی قدر تحریک ریشمی رومال میں ریشمی خطوط کا تعاون شامل ہے۔

اسی طرح تحریک خلافت کی ابتدا ۱۹۱۹ء میں علمائے فرنگی محلی کے ذریعہ ہوئی۔ بعدازاں بی اماں اور علی برادران اس کے سرگرم اور فعال رکن کے طور پر ابھرے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے صحافت اور شاعری کے ذریعہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان کے اشعار نہ صرف اپنے زمانے میں زبانزد خاص و عام ہوئے بلکہ آج بھی انہیں اسی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح مولانا محمد علی جوہرؔ کے تحریر و خطبات اور تقریروں کے ساتھ ساتھ رقعات اور خطوط میں بھی بطور خاص جذبۂ آزادی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنی سرگرم اور ہنگامہ خیز زندگی میں متعدد خطوط لکھے جو بی اماں، مولانا شوکت علی، اپنی اہلیہ، اپنے ہم خیال ساتھیوں، آزادی کے خواہاں ملک کے رہنماؤں اور ہندوستانی عوام کے نام ہیں۔ قید خانے سے بھی بہت سے خطوط اور چٹھیاں لکھیں، انہیں میں سے ایک مختصر خط دیکھئے جو انہوں نے اہل ہند کے نام لکھا ہے:

'میں قید فرنگ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اس لئے اپنے ابنائے وطن سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اجلاس کانگریس کے موقع پر جو

احمد آباد میں منعقد ہوگا جمہوریت ہند کا اعلان کر کے مجھ کو اس سے رہا کرالیں۔'

(خطوط مولانا محمد علی صاحب و مولانا شوکت علی صاحب، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۸)

اسی طرح کا ایک اور خط دیکھئے جس میں علی برادران اور ان کے ہمراہ دیگر قیدیوں نے مل کر ہندوستانی عوام کو پیغام دیا ہے۔

'ہم اپنے تمام مذہبی اور وطنی بھائیوں کی خدمت میں سلام مسنون پیش کرتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں کہ ہم سب گورنمنٹ کی اس کاروائی پر نہایت فراخ دلی اور عالی حوصلگی سے صابر ہیں اور خدا کا شکر کرتے ہیں کہ ہم کو اس نے توفیق عطا فرمائی کہ مذہب اور وطن کی آزادی اور قوم کی وجہ سے ہم پر ہر قسم کے مصائب ڈھانے کی فکریں کی جارہی ہیں اور ہم اس خدائے وحدہٗ لاشریک لہ کے فضل و کرم سے نہایت اطمینان اور استقامت سے عمل کرنے کے لئے تیار ہیں۔ آپ سب بھائیوں اور بزرگوں سے ہماری التجا ہے کہ آپ ہماری طرف سے ہرگز فکرمند نہ ہوں بلکہ تحریکات حاضرہ میں اور زیادہ قدم بڑھائیں، نہایت سرگرمی سے دلچسپی سے کام کریں حتی الوسع جس قدر جلد ممکن ہو قوم اور وطن کو آزاد کرا کر حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اتفاق کو بڑھائیں، غافلوں کو چونکائیں، سوتوں کو بیدار کریں، نفسی اور شخصی اغراض کو پس پشت ڈالیں، نرمی اور لطف سے کام کریں، نقص امن اور خونریزی وغیرہ سے بچنے کی کوشش کریں، ہمت نہ ہاریں۔ مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیں، مردانہ وار قدم آگے بڑھائیں۔ کوشش کا نتیجہ کامیابی ضرور ہے، سوراج کی منزل اب بہت قریب آگئی ہے۔ ہم لوگوں کو بھی دعاؤں میں نہ بھولیں۔ مذہب کے ساتھ ساتھ آپ حضرات اور ہمارا پیارا وطن ہمارے دل میں جاگزیں ہے، خداوند کریم جلد وہ دن لائے کہ آپ اور ہم نہایت خوشی اور خرمی کے ساتھ آزادی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں۔ آمین یارب العالمین۔'

(خطوط مولانا محمد علی صاحب و مولانا شوکت علی صاحب، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ دسمبر ۲۰۱۴ء، ص ۲۷۹)

۱۹۳۵ء میں منشی پریم چند نے خط کے ذریعہ پنڈت بنارسی داس چترویدی کو اپنے مشن کے بارے میں یوں اطلاع دی:

'اس وقت سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ ہم آزادی کی لڑائی میں فتحیاب ہوں۔ دولت یا کامیابی کی آرزو مجھے کبھی نہیں رہی۔ کھانے کو بھرپور مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں، ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھوں۔'

(اطہر مسعود خاں، پریم چند کے فن پر تحریک آزادی کے اثرات، ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۲۰۱۱ء، ص ۲۸)

قصہ مختصر یہ کہ ہندوستانی عوام میں بے شمار افراد نے انگنت خطوط و رقعات دورِ غلامی میں لکھے جن میں سے بیشتر ضائع بھی ہوگئے۔ لیکن اب بھی برصغیر کے کتب خانوں کے علاوہ برطانیہ، یورپ اور بیرون ملک کے کتب خانوں میں ایسے خطوط اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ انہیں تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں برصغیر کے سرکاری آرکائیوز وغیرہ میں ان خطوط کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تمام مکتوبات کی حصولیابی سے امکان قوی ہے کہ ان کی بنیاد پر آزادی کی تحریک سے متعلق مزید حقائق روشن ہوں گے۔

مجاہدین آزادی، محب وطن رہنما اور پڑھے لکھے عوام و خواص نے خطوط میں بکثرت انگریزوں کی رودادِ ظلم رقم کی نیز ان خطوط میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کا اظہار موجود ہے۔ متعدد انقلابی رہنما اخبارات و وسائل کے مدیر بھی تھے، وہ اپنے اخبارات میں بھی قارئین کے ارسال کردہ مراسلے شائع کرتے تھے۔ ان مراسلوں میں بھی ملکی حالات کی منظر کشی اور آزادی کی تحریکوں سے متعلق جلسہ و جلوس، احتجاج و مزاحمت وغیرہ کی سچی کہانی بیان کی گئی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ ہندوستانی عوام میں بے شمار افراد نے انگنت خطوط و رقعات دورِ غلامی میں لکھے جن میں سے بیشتر ضائع بھی ہوگئے۔ لیکن اب بھی برصغیر کے کتب خانوں کے علاوہ برطانیہ، یورپ اور بیرون ملک کے کتب خانوں میں ایسے خطوط اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ انہیں تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں برصغیر کے سرکاری آرکائیوز وغیرہ میں ان خطوط کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ ان تمام مکتوبات کی حصولیابی سے امکان قوی ہے کہ ان کی بنیاد پر آزادی کی تحریک سے متعلق مزید حقائق روشن ہوں گے۔ ساتھ ہی متذکرہ خطوط اور رقعات کے مطالعہ سے نہ صرف انقلاب ۱۸۵۷ء اور تحریک آزادی بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے برصغیر کی پوری تاریخ کی متعدد گمشدہ کڑیوں کی بازیافت ہوگی اور ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

الغرض تحریک آزادی کی ابتدا سے ہی ہندوستانیوں نے اپنے نجی و عام خطوط میں جذبۂ آزادی کا جابجا اظہار کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بے شمار خطوط تمام و کمال آج ہمارے سامنے نہیں، حد تو یہ ہے کہ بعض مشاہیر کے مکتوبات دستیاب ہی نہیں ہو پاتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جدو جہد آزادی کا زمانہ نہایت پرآشوب تھا۔ اس ہنگامی حالات میں اکثر و بیشتر افراد بے سروسامانی اور پئے در پئے ہجرت سے دوچار رہے۔ ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری اور آتشزنی کا بازار گرم تھا۔ اس باعث جہاں نہ صرف گھر بار، مال و اسباب تک تلف ہوگیا بلکہ جان کا بھی زیاں ہوا وہاں کاغذات اور کتابوں کی کیا بساط تھی لہٰذا ایسی صورت حال میں لوگ اپنے خطوط کیا سنبھالتے۔

❑❑❑

ایک گمنام شخصیت

مجاہد آزادی کرنل نظام الدین

محمد رضا
مبارکپور، اعظم گڑھ
موبائل: 9369521135

نظام الدین مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے ۔ ۲۵ برس کی عمر میں وہ روزی روٹی کی تلاش میں ماں کو بتائے بغیر سنگاپور چلے گئے جہاں ان کے والد امام علی کینٹین چلاتے تھے۔ اپنے والد کے ساتھ کئی برس کام کیا۔ پھر انہوں نے برٹش آرمی جوائن کرلی۔ اسی دوران برٹش سے جاپان کی لڑائی شروع ہو گئی لڑائی کے دوران برٹش لیفٹیننٹ نے نظام الدین سے کہا کہ ’’ہندوستانی چاہے جتنے بھی مر جائیں اگر مرتے ہیں تو مرنے دو مگر ہمارے برٹش کے جو جانور ہیں وہ نہیں مرنا چاہئے‘‘۔ اس بات سے نظام الدین بہت ہی رنجیدہ ہوئے اور دل میں سوچا کہ ہم ہندوستانیوں کی ان برٹش لیفٹیننٹ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چونکہ نظام الدین سچے اور وفادار ہندوستانی تھے اور بہت زیادہ غصے والے بھی تھے۔ نظام الدین ہندوستانیوں کی بے عزتی برداشت نہ کی آخر کار انہوں نے برٹش کے لیفٹیننٹ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا اور برٹش آرمی کو چھوڑ سیدھے نیتا جی سبھاش چندر بوس سے آکر ملاقات کی۔ انہوں نے سارا واقعہ بیان کیا۔ ان کی بات کو سن کر سبھاش چند بوس بہت خوش ہوئے اور ان کو گلے لگالیا یہ کہہ کر کہ آپ ہندوستان کے ایک اچھے وفادار باشندے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ نیتا جی نے نظام الدین کو ہدایت دی کہ آج کے بعد آپ اپنا نام کسی کو سیف الدین نہ بتانا آج سے میں آپ کا نام نظام الدین رکھتا ہوں۔ نظام الدین نام سبھاش چندر بوس ہی کا دیا ہوا نام ہے۔

سنگاپور ہی میں وہ آزاد ہند فوج میں اس وقت شامل ہو گئے جب نیتا جی سبھاش چندر بوس ’’آزاد ہند فوج‘‘ کے لیے نئے جوانوں کی تلاش میں تھے۔ نیتا جی نے نظام الدین کو نجی محافظ اور ڈرائیور کی شکل میں منتخب کرلیا اور نظام الدین اپنی صلاحیت کی بنیاد پر اس فوج کا اہم حصہ بن گئے۔ ان کا اصل نام سیف الدین تھا لیکن انٹیلی جنس تنظیم آئی این اے (INA) کے انتخاب کے بعد انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے نظام الدین رکھ لیا تھا۔ ٹائم آف انڈیا کی ۲۰ ستمبر ۲۰۱۵ کی رپورٹ کے مطابق کرنل نظام الدین جس گاڑی کے ڈرائیور تھے وہ گاڑی بارہ سلنڈر کی تھی اور اس گاڑی کو ملایا کے راجہ نے سبھاش چندر بوس کو تحفے میں دیا تھا۔ ان کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ میرے والد نظام الدین مجھے بتایا کرتے تھے کہ یہ گاڑی برق رفتار جیسی تیز چلتی تھی اور بہت زیادہ مضبوط بھی تھی۔ ان کے بقول جہر بارو کے راجہ ’’سلطان‘‘ نے نیتا جی کو برما میں بطور تحفہ دیا تھا۔ کرنل نظام الدین نیتا جی کے ساتھ امریکا، ٹوکیو، ناگاساکی، ہیروشیما، لندن، کمبوڈیا جنوبی مشرقی ایشیا، ویت نام، لاؤس، برما، رنگون، تھائی لینڈ، جاپان، ملیشیا جیسے متعدد شہروں کا سفر کیا۔

کرنل نظام الدین سے گفتگو کے دوران اس بات کا ہمیں علم ہوا کہ سبھاش چندر بوس کے ساتھ انہوں نے کافی وقت گزارا۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر نیتا جی کے حساب سے ہندوستان کو آزادی ملتی تو آج بھارت کا کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس ایسے با ثر اور پر کشش لیڈر تھے کہ جو بھی آپ سے ملاقات کرتا وہ نیتا جی گن گانے لگتا اور بلا آخر نیتا جی کا ہی ہو کر رہ جاتا تھا۔ کرنل نظام کہتے ہیں کہ جب میں نے ان سے سوال کیا کہ ہم لوگ کیسے ہندوستان کی خدمت کریں تو انہوں نے کہا کہ آپ صرف ہم کو دیکھیں کہ میں کیسے ہندوستان کی خدمت کر رہا ہوں تو اس کے جواب میں نظام الدین نے کہا کہ آپ کو اوپر والا یعنی اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ ضرور آپ کو اس کا ثمرہ دے گا۔ وہ مجھ سے کہتے تھے جب بھی گاڑی چلانا میٹر کی طرف مت دھیان دینا اس کا شاید یہ مقصد ہوسکتا ہے ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر وقت ہر لمحہ جب جیسی ضرورت ہو اس رفتار سے گاڑی چلانا۔

کرنل نظام کہتے ہیں کہ جب میں نے ان سے سوال کیا کہ ہم لوگ کیسے ہندوستان کی خدمت کریں تو انہوں نے کہا کہ آپ صرف ہم کو دیکھیں کہ میں کیسے ہندوستان کی خدمت کر رہا ہوں تو اس کے جواب میں نظام الدین نے کہا کہ آپ کو اوپر والا یعنی اللہ دیکھ رہا ہے۔ وہ ضرور آپ کو اس کا ثمرہ دے گا۔
وہ مجھ سے کہتے تھے جب بھی گاڑی چلانا میٹر کی طرف مت دھیان دینا اس کا شاید یہ مقصد ہوسکتا ہے ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر وقت ہر لمحہ جب جیسی ضرورت ہو اس رفتار سے گاڑی چلانا۔

کرنل نظام الدین نے اپنے ایک انٹرویو کے میں کہا کہ وہ نیتا جی کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے ان کو سادہ کھانا بہت پسند تھا جن میں دال، چاول سبزی وغیرہ

شامل تھی۔ اگر ہم آگ اردو اخبار ۶ رفروری ۲۰۱۷ کی خصوصی ہائی لائٹس کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ فوج کی تشکیل کے بعد نیتا جی سبھاش چندر بوس اکثر فوج کے تمام اراکین کے ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے۔ ان کی انکساری کا عالم یہ تھا کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے کھانا دینے لگتے تھے۔ ان کی پسندیدہ غذا سبزی تھی۔ مرغوب سبزیوں میں انہیں لوکی اور بھنڈی سب سے زیادہ پسند تھی۔ مگر کبھی بھی مچھلی کھا لیتے تھے۔ ان کو چاول سب سے زیادہ پسند تھا۔ بنگلہ ہیل کھانے میں انہیں خوب لطف آتا تھا۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس کا لباس دھوتی اور کرتا تھا۔ گلابی گمچھا بہت کافی عزیز تھا۔ فوج کے قیام کے بعد وہ فوجی شکل میں رہتے تھے۔ وہ ۲۴ گھنٹے میں دو بار کپڑے تبدیل کرتے تھے اور رات کو سوتے وقت بھی وہ اکثر بغیر کسی کو بتائے اپنا مقام تبدیل کر دیتے تھے۔ اپنے افسروں سے بھی اپنے مخفی پلان کے بارے میں نہیں بتاتے تھے۔ بہت سی خفیہ باتوں کا تذکرہ نیتا جی سبھاش چندر بوس رات کو سوتے وقت کرتے تھے۔

کرنل نظام الدین نے بتایا تھا کہ آزاد ہند فوج کے قیام کے ساتھ نیتا جی نے لوگوں کو رنگون میں جمع ہونے کو کہا تھا۔ جولائی ۱۹۴۳ کو برما، سنگاپور، رنگون اوورسیز۔ ہندوستانیوں نے فنڈ کے لئے ۲۶ بوریوں سونے، چاندی، ہیرے جواہرات اور پیسوں سے نیتا جی کو ترازو میں تول دیا تھا۔ نظام الدین کے مطابق: ہم نے پیٹھ پر لاد کر بوریوں کو خزانے میں رکھا تھا اور سب نے حلف لیا تھا کہ ملک کی آزادی کے لئے سب کچھ قربان کر دیں گے۔ لوگوں کی حب الوطنی دیکھ کر نیتا جی جذباتی ہو گئے تھے۔ ۹ جولائی ۱۹۴۳ کو نیتا جی نے ایک نعرہ دیا'' کرو تمام نیوچھاور بنو تمام فقیر''اس نعرے کے بعد رنگون میں آزاد ہند فوج کے لیے بینک میں ایک دن میں ۲۰ کروڑ روپئے جمع ہو گئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۴۳ میں آزاد ہند حکومت کو منظوری مل گئی۔ آزاد ہند فوج کی کرنسی کو'' مانڈلے'' کہتے تھے یہ کرنسی برما میں چھپا کرتی تھی۔ ان کی تنخواہ اس وقت صرف ۱۷ روپئے تھی۔ فوج میں ایک پیسہ میں ۲ کڑا اور دو کڑے میں چار پائی ہوا کرتی تھی۔ سال ۱۹۴۳ میں آزاد ہند بینک نے پہلی بار ۵۰۰ کے نوٹ کو جاری کیا تھا جس پر نیتا جی کی تصویر چھپی تھی۔ اس دوران لیفٹیننٹ کو ۸۰ روپئے تنخواہ ملتی تھی۔ برما میں جتنے افسران موجود تھے ان کو ۲۳۰ روپئے ملتے تھے اور لیفٹیننٹ کرنل کو ۳۰۰ روپئے ملتے تھے۔

کرنل نظام الدین کے مطابق نیتا جی نے اپنا انٹیلی جنس گروپ بنایا تھا اور ان کا خفیہ محکمہ بھی تھا، جس کے وہ سربراہ افسر تھے۔ خفیہ محکمہ کا نام'' بہادر گروپ'' تھا۔ اس میں بہت کم اہلکار اور فوجی تھے۔ خفیہ محکمہ سب سے زیادہ فعال برطانوی معلومات کو جمع کرنے میں رہتا تھا۔ اس کا نیٹ ورک چند ماہ میں ہی ملک کے کئی علاقوں تک پھیل گیا۔ نیتا جی کئی بار آبدوز سے سراغ رساں کو سنگاپور اور بینکاک بھی بھیجتے تھے۔

کرنل نظام الدین کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے وہ گیارہ زبانوں کے صرف جاننے والے نہیں تھے بلکہ ان کو ان گیارہ زبانوں پر بھرپور عبور بھی حاصل تھا۔ اس وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انہوں نے نیتا جی سبھاش چندر بوس کے ساتھ متعدد ممالک کا دورہ کیا اپنے دورے کے دوران ان کو کئی زبانوں سے سابقہ بھی ہوا جس کی وجہ سے انہوں نے زبانوں کو سیکھا اور بولنے لگے۔ کرنل نظام الدین کی نشانہ بازی بھی بے مثال تھی۔ ان کی نشانہ بازی کی مثال دی جاتی تھی اور ان کو عظیم نشانہ باز کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے جب جرمنی کے برلن میں نیتا جی سبھاش چندر بوس کے ساتھ ہٹلر سے ملے تو ہٹلر نے نظام الدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہی تب نیتا جی نے کہا کہ یہ میرے باڈی گارڈ اور اچھے شوٹر ہیں۔ ۱۹۴۵ میں انہوں اپنے نشانے کا جوہر دکھاتے ہوئے برٹش جہاز کو مار گرایا تھا۔

ان کے بیٹے شیخ اکرم کے بقول؛ مئی ۱۹۴۲ میں جرمنی کے برلن میں نیتا جی کی ملاقات ہٹلر سے ہوئی تھی۔ میرے والد کرنل نظام الدین جرمنی کے برلن میں نیتا جی اور ہٹلر ملے تھے۔ تب ہٹلر نے ان کے بارے میں معلومات طلب کی تھی۔ نیتا جی نے بتایا تھا کہ میرے باڈی گارڈ اور اچھے شوٹر ہیں۔ ہٹلر نے اپنی ہاتھی کے دانت بٹ والی پستول (جس کے دستے پر ببیل کے سر کا فوٹو کندہ تھا) اور ریڈیو کرنل نظام الدین کو تحفے میں دیا تھا۔ ۱۹۶۹ میں کرنل نظام الدین کا خاندان اعظم گڑھ ڈھکوا گاؤں آیا تو ریڈیو کو اپنے پاس رکھا مگر پستول کو اپنے رشتہ دار عبدالستار کو دے دیا۔

محمد شہزاد قلمکار کے مطابق نظام الدین نے ان کو اپنی پشت پر لگی گولی کے نشان کو انہیں دکھایا جو انہیں برما کے جنگل میں نیتا جی کی حفاظت کرتے ہوئے لگی تھی۔ کرنل نظام کے مطابق انگریز نیتا جی سبھاش چندر بوس کو نشانے پر رکھ کر گولی چلائی تھی لیکن ٹھیک اسی وقت نیتا جی کا رومال گر گیا اور جیسے میں رومال اٹھانے کے لیے اٹھا گولی مجھے لگ گئی۔ آزاد ہند فوج میں نیتا جی کے سب سے بھروسے مند فوجیوں میں سے کیپٹن لکشمی سہگل نے گولی نکالی جو اس وقت فوج میں بطور ڈاکٹر

ان کے بیٹے شیخ اکرم کے بقول؛ مئی ۱۹۴۲ میں جرمنی کے برلن میں نیتا جی کی ملاقات ہٹلر سے ہوئی تھی۔ میرے والد کرنل نظام الدین جرمنی کے برلن میں نیتا جی اور ہٹلر ملے تھے۔ تب ہٹلر نے ان کے بارے میں معلومات طلب کی تھی۔ نیتا جی نے بتایا تھا کہ میرے باڈی گارڈ اور اچھے شوٹر ہیں۔ ہٹلر نے اپنی ہاتھی کے دانت بٹ والی پستول (جس کے دستے پر ببیل کے سر کا فوٹو کندہ تھا) اور ریڈیو کرنل نظام الدین کو تحفے میں دیا تھا۔ ۱۹۶۹ میں کرنل نظام الدین کا خاندان اعظم گڑھ ڈھکوا گاؤں آیا تو ریڈیو کو اپنے پاس رکھا مگر پستول کو اپنے رشتہ دار عبدالستار کو دے دیا۔

کام کرنے والی تھیں ۔ انہی کے علاج سے وہ صحت یاب ہوئے اور تبھی سے نیتا جی نے انہیں کرنل کہہ کر پکا را تھا ۔ ۲۰ راگست ۱۹۴۷ کو نیتا جی کو برما میں چھتانگ ندی کے پاس آخری بار کشتی پر چھوڑا۔

نظام الدین کہتے ہیں کہ: جب میں سبھاش چندر بوس کو چھتانگ ندی تک پہنچانے گیا تو ندی کے کنارے ایک کشتی پہلے ہی رکی ہوئی تھی سبھاش چندر بوس کو لے جانے کے لیے۔ چھتانگ ندی کے آگے جا کے سمندر سے ملتی تھی ۔ ندی کے بیچ میں ایک پنڈبی کھڑی تھی نیتا جی لے جانے کے واسطے ۔جس پر کشتی پر سبھاش چندر بوس جی بیٹھے تھے اس پر جاپانی افسر اور ہندوستانی لوگوں کے ساتھ کچھ سردار بھی موجود تھے ۔ اس کشتی پر ایک مدراسی تھا جو نیتا جی کا بہت قریبی تھا۔ ان کے علاوہ اس کشتی پر حبیب الرحمن بھی تھے ۔ وہ آگے بتاتے ہیں کہ انہوں نے کشتی پر نیتا جی کو بٹھایا اور کشتی پنڈبی کی طرف روانہ ہوگئی کچھ دور تک تو میں انہیں دیکھتا رہا مگر ندی کے کنارے درخت اور چھاڑیوں کے وجہ سے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا کشتی کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد ایک فائٹر جہاز آیا جس نے اس گاڑی پر بم برسائے جس پر ہم لوگ نیتا جی کو چھوڑنے آئے تھے ۔جس میں بہت سارے لوگ مارے گئے اور گاڑی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ۔ہم لوگ بھی گھائل ہو گئے مگر جان بچ گئی ۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا مگر نیتا جی سبھاش چندر بوس نے کہا کہ دیکھو نظام الدین تم نہ جاؤ ہم تم سے ہندوستان میں ملاقات کریں گے ۔تم کو میں ذمہ داری دیتا ہوں کہ جتنے بھی ہندوستانی بچے ہیں ان کے سارے کاغذات جلا دو اور سب کو لیکر ہندوستان چلے جاؤ جب میں آؤں گا تو ہم اپنے وطن ہندوستان سے آزادی کی جنگ لڑیں گے ۔واضح ہو کہ یہ ساری باتیں ان کی ذاتی ڈائری میں لکھی ہوئی ہیں ۔

کرنل نظام الدین ولد امام علی ۔ پیدائش یکم جنوری ۱۹۰۰ میں اتر پردیش کے ڈھکوہ، قصبہ مبارک پور، اعظم گڑھ میں ہوئی ۔آپ کے شناختی کارڈ کا نمبر 0084182/218/UP/46 ہے۔ ۔جس پر آپ کا نام سیف الدین ولد امام علی درج ہے ۔آپ کی عمر ۱۱۷ برس کی تھی ۔ ہندوستان کے مجاہد آزادی میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ شخص سیف الدین عرف کرنل نظام الدین تھے ۔ اگر یہ بات ثابت ہے کہ نظام الدین کی عمر وہی ہے جو ان کے شناختی کارڈ اور پاسپو رٹ پر لکھی ہے اور آپ دنیا کے سب سے معمر شخص ثابت ہوئے ۔

آپ کی بیوی جن کا نام عجب النسا ہے جن کی عمر ۱۰۷ برس کی ہو چکی ہے ابھی وہ با حیات ہیں ۔آپ کے تین بیٹے ہیں ۔اختر علی ۷۲ سال، انور علی ۶۵ سال اور شیخ اکرم جن عمر ۵۵ برس ہے یہ سب سے چھوٹے بیٹے اپنے بابو جی کے ساتھ رہتے ہیں ۔ بیٹی حبیب النسا ۸۵ برس کی ہیں ۔آپ کے بیٹے شیخ اکرم کے مطابق ان کی پسندیدہ غذا سبزی ہے جس میں آپ کو کریلا بہت پسند ہے۔انہوں نے کبھی گوشت یا انڈا نہیں کھایا۔کرنل نظام ہمیشہ دودھ پیتے ہیں بغیر دودھ پیئے وہ رہ ہی نہیں سکتے ہیں ۔ شیخ اکرم کے بقول ۱۰ سے ۱۵ آدمیوں کو ایک ساتھ مار گرانے کی طاقت تھی ۔رات کو جلدی کھانا ان کی عادت ہے ۔ان کے بیٹے کا کہنا ہے کہ ان کو کبھی ذیابیطس یا ہائی بلڈ پریشر کی شکایت نہیں رہی ۔صبح اٹھنے پر دودھ، دوپہر میں دیسی گھی کے ساتھ دال اور سبزیاں اور رات کو سونے سے پہلے دودھ پینا کسی نوجوان کی خوراک ہو اور وہ ۱۱۷ برس کی عمر میں فوت ہو جائے تو تعجب نہیں ہوگا۔

آپ کی بیوی جن کا نام عجب النسا ہے جن کی عمر ۱۰۷ برس کی ہو چکی ہے ابھی وہ با حیات ہیں ۔آپ کے تین بیٹے ہیں ۔اختر علی ۷۲ سال، انور علی ۶۵ سال اور شیخ اکرم جن عمر ۵۵ برس ہے یہ سب سے چھوٹے بیٹے اپنے بابو جی کے ساتھ رہتے ہیں ۔ بیٹی حبیب النسا ۸۵ برس کی ہیں ۔آپ کے بیٹے شیخ اکرم کے مطابق ان کی پسندیدہ غذا سبزی ہے جس میں آپ کو کریلا بہت پسند ہے۔انہوں نے کبھی گوشت یا انڈا نہیں کھایا۔کرنل نظام ہمیشہ دودھ پیتے ہیں بغیر دودھ پیئے وہ رہ ہی نہیں سکتے ہیں ۔ شیخ اکرم کے بقول ۱۰ سے ۱۵ آدمیوں کو ایک ساتھ مار گرانے کی طاقت تھی ۔رات کو جلدی کھانا ان کی عادت ہے۔

۱۹۵۵ میں نظام الدین پہلی مرتبہ اپنے وطن مبارکپور آئے اور اپنے ضعیف والد کی خدمت کرنے لگے لیکن ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں کسی نے ان کو اطلاع دے دی تو میں گرفتار ہو جاؤں گا۔اسی درمیان ان کے والد امام علی کا انتقال ہو گیا۔انہوں نے ان کی تدفین کے فرائض کو پورا کر کے دوبارہ برما چلے گئے ۔ ۵ رجون ۱۹۶۹ کو کرنل نظام الدین برما سے اپنے آبائی وطن مبارک کے ڈھکوہ گاؤں لوٹے ۔انہوں نے اپنی پہچان ۲۰۰۱ میں ظاہر کی ۔جب میں نے ان سے ملاقات کی وہ کافی ملنسار ،حب الوطنی میں سرشار، جذبۂ حریت کا موجیں مارتا ہوا طوفان اس وقت بھی ان میں موجود تھا ۔ہندوستان سے محبت کا عالم یہ تھا کہ ۱۱۷ برس کی ضعیفی کے باوجود جب وہ اونچا سننے لگے تو انہوں نے کان کی مشین لگائی اور روز بلا ناغہ ریڈیو، ٹی وی پر خبر سننا کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے ۔ یہ ہندوستان سے محبت نہیں تو اور کیا تھی ۔ان کے بیٹے نے مجھے بتایا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے بابو جی کے گھٹنے میں درد کی شکایت رہتی ہے جس کے لیے وہ آج تک درد کش دوا کھا رہے ہیں چونکہ معمر ہیں تو ڈاکٹر نے کہا ہے کہ مہینے میں ایک بار طاقت کا انجکشن لگوانا ضروری ہے ۔ میں نے ان کے بیٹے شیخ اکرم کے توسط سے دیکھا ان کے والد کی آزاد ہند فوج کی ٹوپی، ان کا شناختی کارڈ، نیتا جی کی گاڑی کا ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ اور بہت سارے کاغذات جو پرانے ہونے وجہ سے سنہرے ہو گئے تھے ۔ کچھ تو ایسے کاغذات تھے پرانے ہونے کی وجہ سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے

ہونے لگے تھے اوران کی جوانی کی فوٹو۔کچھ سال قبل نیتاجی سبھاش چندر بوس کی پر پوتی راج شری چودھری بھی نظام الدین سے ملنے ان کے آبائی وطن مبارک پور ،ڈھکوہ گئی تھیں۔

۹رمئی ۲۰۱۴ میں لوک سبھا انتخابات کے دوران وارانسی کی ایک ریلی میں بی جے پی کے امیدوار جناب نریندر مودی نے کرنل نظام الدین کو اسٹیج پر بلاکر شال اڑھائی اوران کی قدم بوسی کرکے ان سے دعائیں لیں اوران کی حو صلہ افزائی کی۔۶رفروری بروز دوشنبہ ۲۰۱۷ کوعلی الصبح ۴ بجے نظام الدین مجا ہد آزادی کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ان کی نماز جنازہ مولانا وفا مبارکپور کے بیٹے نے بڑھائی اورتدفین ان کے آبائی وطن کے قبرستان مبارک پور،ڈھکوہ میں دوپہر بعدعمل میں آئی۔

مجا ہدآزادی کے انتقال پر وزیراعظم نریندر مودی نے اپنے ٹوئیٹ کے ذریعہ تعزیتی پیغام دیا۔انہوں نے اپنے ٹوئیٹ کے ساتھ کرنل نظام الدین کے ساتھ اپنی تصویر بھی پوسٹ کی جس میں وہ مجاہدآزادی کی قدمبوسی کررہے ہیں۔

انہوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ ''سبھاش بابو کے قریبی ساتھی کرنل نظام الدین کو میرا خراج عقیدت۔میں ان کے ساتھ اپنی ملاقات کو یاد کرتا ہوں۔ان کے انتقال رنج وغم کی علامت ہے۔''

''ہم کرنل نظام الدین کے نظریات ان کے حوصلہ اور وطن پرستی کو ہمیشہ یاد رکھیں گے جس نے ہماری جدوجہد آزادی کوتقویت پہنچائی''۔آزاد ہندفوج کے سپاہی نظام الدین جنہیں کرنل بھی کہا جاتا تھا۔

دوسال قبل شیخ اکرم وہاں کے ڈی ایم سے ملے اورانہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ جو کچھ واقعات ان کے ساتھ ہوئے ہیں ان کو ڈائری کی شکل دی جائے۔ ڈی ایم نے بی ایس اے سے کہا۔بی ایس اے نے اپنے آدمیوں کو بھیجا۔انہوں بہت ساری واقعات اور تذکرے،نظام الدین سے اوران کے بیٹے سے انٹر ویولے کر ۳۵ صفحات پر مشتمل کتاب تیار کی۔مگر شیخ اکرم کا کہنا ہے کہ اس ڈائری میں بہت کچھ چھوٹا ہوا بہرحال یہ ڈائری اتر پردیش کے وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ سے ملاقات کرکے دینا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خود وزیر اعلیٰ اپنے ہاتھوں سے اس ڈائری کولانچ کریں۔ان کی خواہش ہے کہ ہر کالج اور اسکول میں کرنل نظام الدین کے بارے میں پڑھایا جائے۔ ساتھ ہی ان کے پورے خاندان کی یہ خواہش ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کے بابو جی کی پنشن جاری ہوجائے تاکہ ان کی ماں کے علاج میں تھوڑی بہت راحت مل سکے۔

❑❑❑

مجاہدآزادی کے انتقال پر وزیراعظم نریندر مودی نے ٹوئیٹ کے ذریعہ تعزیتی پیغام دیا۔انہوں نے اپنے ٹوئیٹ کے ساتھ کرنل نظام الدین ساتھ اپنی تصویر بھی پوسٹ کی جس میں وہ مجاہدآزادی کی قدمبوسی کررہے ہیں۔

انہوں نے کہا اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ ''سبھاش بابو کے قریبی ساتھی کرنل نظام الدین کو میرا خراج عقیدت۔میں ان کے ساتھ اپنی ملاقات کو یاد کرتا ہوں۔ان کے انتقال رنج وغم کی علامت ہے۔''

'نیادور' ستمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے کی ایک جھلک

مغل دور میں فن صحافت پر نیلوفر حفیظ،سوشل اور الکٹرانک میڈیا کے اسرار ورموز پر عرفان علی کے مضامین

ادب کے نوبل انعام سے سرفراز جرمن زبان کی ادیبہ ہیرٹا مئولر کے ناول کا اقتباس

فضل حسنین کا مزاحیہ

جابر حسین،عبیداللہ چودھری اور ترنم جہاں شبنم کے افسانے

احمد وصی،رئیس الشاکری کی نظمیں اور افشاں شاہین،ملک زادہ جاوید،جاوید اکرم کی غزلیں

مراٹھی ناول ایندھن کی پانچویں قسط،ہندی کہانی اور دیگر تخلیقات

غزل

زندگی ایک ہی محور پہ ہے اب تک یا رب
دائرہ بن کے رہوں رقص میں کب تک یا رب

کس لئے دل میں کئی زخم ہرے ہیں ایسے
ذہن سے محو ہوئے جن کے سبب تک یا رب

سلسلہ در سلسلہ رنگوں میں الجھتے کیسے
ہم پہنچ جاتے اگر ترک طلب تک یا رب

میں اسی موڑ کا مدت سے تمنائی تھا
ریگ صحرا ہیں جہاں نام و نسب تک یا رب

ہم عجب کیف سے مانوس ہوئے جاتے ہیں
زندگی ٹھہری رہے گریۂ شب تک یا رب

بزم آرائی سے وہ جی کا لرزنا بھی گیا
مرحلے کتنے ہیں اک خندۂ لب تک یا رب

یہ مرا شبنمی احساس سلامت رکھنا
ذہن افکار سے روشن رہیں جب تک یا رب

رباب رشیدی
تازی خانہ، امین آباد، لکھنؤ
موبائل: 9335018112

غزل

کبھی کچھ بھی نہیں ملتا تو حیرانی سی رہتی ہے
ضرورت سے سوا ہو تو پشیمانی سی رہتی ہے

کبھی شہرِ نظر چہروں کی آبادی نہیں بنتا
کبھی دل میں بہت آباد ویرانی سی رہتی ہے

کہیں بے اختیارانہ بدل جاتا ہے لہجہ تک
کہیں آواز بھی اپنوں کی انجانی سی رہتی ہے

ہمارے دوست ہیں وہ بھی اسی باعث انہیں ہم سے
پریشانی نہیں رہتی، پریشانی سی رہتی ہے

ہر اک غواصِ معنی کے ہنر سے خوب واقف ہیں
کہ بحرِ شعر میں اپنی نظر پانی سی رہتی ہے

بہت سادہ ہیں وہ شہپرؔ کبھی کچھ بھی نہیں کہتے
مگر ہر بات میں ان کی ہی من مانی سی رہتی ہے

پروفیسر شہپر رسول
صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
موبائل: 9891721184

غزل

بساط کو پھر زوال کیسا ثنا کی تفسیر کر رہا ہوں
ہوا کی زد میں چراغ رکھ کر چراغ تحریر کر رہا ہوں

یہ خار و خس ہیں یہاں وہاں جو یہ آندھیوں کا ہی زور ٹھہرا
فلک پہ کوئی کلس نہ گنبد مگر میں تعبیر کر رہا ہوں

ہوا چلی تو لرز اٹھا ہے یہ میرا دل بھی نواح جاں میں
مجھے لگا ہے کہ زرد پتوں پہ نقش تحریر کر رہا ہوں

سوادِ شب میں ہیں خواب روشن سوادِ شب میں بساط روشن
اسی کی وابستگی میں سب کچھ اسی کو جاگیر کر رہا ہوں

جہادِ جنگ و جدال میں بھی امین امن و اماں ہوا ہوں
اسی کی ذات و صفات میں گم صدا کو زنجیر کر رہا ہوں

نہ جانے کب تھا زوال میرا ابھی تو خود لازوال ہوں میں
یہی تو رمز مصوری ہے خلاء میں تعمیر کر رہا ہوں

مری نظر میں سراب نیلم ظفرؔ ہیں موتی صدف صدف میں
سحابِ صحرا کی وادیوں میں میں خود کو اکسیر کر رہا ہوں

ڈاکٹر سید ظفر اکبرآبادی
88/69A، پریم نگر، چمن گنج، کانپور
موبائل: 9305067968

غزل

جو دن کو اُگاتا ہے رات کرتا ہے
وہ زندگی میں بھی پیدا ثبات کرتا ہے

کہیں بھی جاؤں کہیں بھی رہوں کروں کچھ بھی
ترا خیال سفر ساتھ ساتھ کرتا ہے

یہاں تو کوئی نہیں چاند ہیں نہ تارے ہیں
مگر یہ کون خموشی میں بات کرتا ہے

بڑے ہی پیار سے آنکھوں کو میری بند کرکے
وہ ایک پل میں مرے دن کو رات کرتا ہے

عجیب پیاس کا رشتہ ہے کیا کہیں اس کو
قدم قدم پہ وہ پیدا فرات کرتا ہے

وفا خلوص محبت ملاپ قربانی
انہی کھلونوں سے وہ تجربات کرتا ہے

ہمارا دور ترقی بھی ہے عجب حیدرؔ
یہاں خلوص سے کب کون بات کرتا ہے

حیدرؔ علوی
مقابل کھ 29/473، کھدرا، لکھنؤ
موبائل: 9919750984

غزل

اس نے مجھ سے بھی بے وفائی کی
لاج رکھی نہ آشنائی کی

میں جو اس کے حضور جا پہنچا
اس کی خوشبو نے رہنمائی کی

اے خدا تو تو جانتا ہی ہے
تیرے بندوں نے بھی خدائی کی

سارے رشتے بھلا دئے اس نے
ایسی پردیس میں کمائی کی

منصف اس کا گواہ بھی اس کے
کیا ضرورت ہے پھر صفائی کی

فکر دی ہے تو پھر قلم بھی دے
کچھ کمی ہو نہ روشنائی کی

میں ہی کوتاہ دست ہوں اخترؔ
کیا شکایت ہو نارسائی کی

اخترؔ شاہجہاں پوری
رنگین چوپال، شاہجہاں پور
موبائل: 8953035474

غزل

مری وفا کے تعلق سے واہمے رکھنا
اور انتظار میں ہر گام پر دئے رکھنا

ملو تو کھل کے ملو یہ بھی کیا تکلف ہے
حصارِ ذات کے اندر بھی دائرے رکھنا

مسیح وقت کبھی تو ادھر سے گزرے گا
سجے ہوئے سے خیالوں کے بتکدے رکھنا

نہ جانے کس گھڑی یادوں کے قافلے اتریں
دیارِ دل میں اجالوں کے سلسلے رکھنا

ہمیں پسند نہیں یہ ادا زمانے کی
کہ جس سے پیار کریں اس سے فاصلے رکھنا

پس غبار دکھائی دیا نہ جب کچھ بھی
ہمیں بھی آ گیا شفاف آئینے رکھنا

ضرور لوٹیں گے وہ لوگ جنگ سے مدہوشؔ
بچا کے ان کے لئے بھی تو مرتبے رکھنا

مدہوشؔ بلگرامی
۲۲۴، بہرا سوداگر ایسٹ، ہردوئی
موبائل: 8726189282

غزل

تھی وہ عجلت پسند کم ٹھہری
حجرۂ دل میں دو قدم ٹھہری

اپنے آلام ہم پہ تھوپے ہیں
زندگی پھر بھی محترم ٹھہری

چیخنے کا جواز کھو بیٹھا
تب کہیں جاکے آنکھ نم ٹھہری

دیکھئے ارتباط حسن و نظر
اس کے چہرے پہ ایک دم ٹھہری

ایسے عالم میں کوئی کیا بولے
جب ہو پہلو میں شامِ غم ٹھہری

ہم نہ چونکیں گے نام پر تیرے
نیند ہم کو بہت اہم ٹھہری

لاکھ کہنے پہ آپ رکتے نہیں
آپ پر کب کوئی قسم ٹھہری

رہبرؔ سلطانی
115، چندر بھاگا ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
موبائل: 09560029312

غزل

خشک موسم سے ناشناس بدن
دھوپ میں ہو گیا اداس بدن

ماورائے وجود تھا کل تک
آ گیا زندگی کو راس بدن

آئینے سے سوال کرتا ہے
محو حیرت ہے خود شناس بدن

کل بدن زار تھی مری خلوت
اب کہاں میرے آس پاس بدن

کوئی تشریح کر نہیں سکتا
زندگی جیسے بے لباس بدن

خوشبوؤں سے لپٹ کے سویا ہے
حسرتیں اوڑھ کر اداس بدن

رندؔ یادیں 'چتا' میں جلتی ہیں
خاک میں مل گیا اداس بدن

پی پی سریواستورندؔ
R-16، سیکٹر ۱۱، نوئیڈا
موبائل: 9711422058

غزل

نہ دولت چاہئے مجھ کو نہ شہرت چاہتا ہوں میں
میں پیاسا ہوں محبت کا محبت چاہتا ہوں میں

خدا وہ سب تجھے دے دے جو تیرے دل کی حسرت ہے
مگر دل پر ترے اپنی حکومت چاہتا ہوں میں

تری چاہت کو اپنی دل کو مندر کر لیا میں نے
تجھے مورت بنانے کی اجازت چاہتا ہوں میں

اٹھا کر آنکھ جس کو دیکھ لوں ہو جائے وہ میرا
مرے مالک نگاہوں میں کرامت چاہتا ہوں میں

وہ میرے رو بہ رو بیٹھے ہیں تنہائی میں سج دھج کر
زباں تک مدعا لانے کی ہمت چاہتا ہوں میں

غم و آلام سے کہہ دو ذرا سا دور ہٹ جائیں
خدا سے حوصلہ لینے کی مہلت چاہتا ہوں میں

ملی تھی جیسے مجنو رومیو فرہاد کو الیاسؔ
تری الفت میں کچھ ایسی ہی شہرت چاہتا ہوں میں

الیاس چشتی
جوشی ٹولہ کھیری ٹاؤن، لکھیم پور کھیری
موبائل: 9956051551

غزل

تمام رات دیا بن کے جلنے والے لوگ
سحر کو بن کے ہیں سورج نکلنے والے لوگ

ملائکہ کی صفوں سے زمیں پہ آئے تھے
ہماری انگلی پکڑ کر ٹہلنے والے لوگ

وہ ظرف دیکھنے کو اب کہیں نہیں ملتا
سمندروں سے بھی پیاسے نکلنے والے لوگ

برہنہ پا انہیں لایا ہے خارزاروں پر
وہ لوگ تھے جو ستاروں پہ چلنے والے لوگ

خمیر اپنا اٹھا تھا عجیب مٹی سے
کسی کے سانچے میں ہم کب تھے ڈھلنے والے لوگ

مصیبتوں کے وہ سورج سروں پہ رکھے ہوئے
لگا کے چھتریاں گھر سے نکلنے والے لوگ

خدا ہی جانے کہاں تھک کے سو گئے کیفیؔ
وہ رات دن مری آنکھوں میں چلنے والے لوگ

ڈاکٹر کیفی سنبھلی
نمبردار ہاؤس، نوریوں سرائے، سنبھل
موبائل: 9837759663

گیسوؤں میں بندھی بارشیں

ڈاکٹر طارق قمر
12A/1، مال ایونیو، ای ٹی وی نیوز، لکھنؤ
موبائل: 9335915058

ایک مدت ہوئی سوچتے سوچتے
تم سے کہنا ہے کچھ پر میں کیسے کہوں
آرزو ہے مجھے ایسے الفاظ کی
جو کسی نے کسی سے کہے ہی نہ ہوں
سوچتا ہوں کہ موجِ صبا کے سبک پاؤں میں کوئی پازیب ہی ڈال دوں
چاہتا ہوں کہ ان تتلیوں کے پروں میں دھنک باندھ دوں
سرمئی شام کے گیسوؤں میں بندھی بارشیں کھول دوں، خوشبوئیں گھول دوں
پھول کے سرخ ہونٹوں پہ افشاں رکھوں
خواب کی مانگ میں نور سندور کی کہکشاں کھینچ دوں
اک تخیل کی بے ربطیوں کو تسلسل کی زنجیر دوں
خواب کو جسم دوں، جسم کو اسم دوں
کوئی تعبیر دوں ایک تصویر دوں
اور تصویر کو روبرو رکھ کے اک حرفِ توقیر دوں
کیا کہوں۔ یہ کہوں۔ یوں کہوں۔۔ پر میں کیسے کہوں
جتنے الفاظ ہیں سب کہے جا چکے سب سنے جا چکے
تشنہ اظہار کو، معتبر سا کوئی اب سہارا ملے
اک کنایہ ملے اک اشارہ ملے
خوبصورت انوکھی علامت ملے، ان کہا ان سنا استعارہ ملے
آرزو ہے مجھے ایسے الفاظ کی جستجو ہے مجھے ایسے الفاظ کی
جن سے پتھر کو پانی کیا جا سکے
خواب کو اک حقیقت کیا جا سکے
ایک زندہ کہانی کیا جا سکے

غزل

اپنی پسپائی کا اعلان نہیں ہو کیا تم
خود سے ہی دست و گریبان نہیں ہو کیا تم

ایک ٹوٹی ہوئی تلوار اور ایسی گفتار
زندہ رہنے پہ پشیمان نہیں ہو کیا تم

چیخ سکتے تھے جہاں اب تو وہاں بھی چپ ہیں
اس تغیر پہ بھی حیران نہیں ہو کیا تم

اب وہ کیسا ہے، کہاں ہے، کیا ابھی تنہا ہے
ان سوالوں سے پریشان نہیں ہو کیا تم

اپنے سر لے لیا خود اپنے ہی خوں کا الزام
اب بھی شرمندۂ احسان نہیں ہو کیا تم

دونوں ہی ٹوٹ گئے جنگ انا لڑتے ہوئے
نیم جاں میں ہوں تو بے جان نہیں ہو کیا تم

کیا ضروری ہے ہر اک بات زباں سے کہنا
میری بربادی کا اعلان نہیں ہو کیا تم

پوچھنے آتی ہے بچھڑی ہوئی خوشبو ہر شب
راکھ تو ہو گئے لوبان نہیں ہو کیا تم

رونق شہر کی کیوں فکر ہے اتنی طارقؔ
اب بھی اندر سے بیابان نہیں ہو کیا تم

نظم

سید آصف جاہ
13/304، اتسو نیو لنک روڈ، اوشی وارا، اندھیری ویسٹ، ممبئی
موبائل: 9820093110

میں نے چپ کے سے ترا نام لیا
دل نے محسوس کیا
جیسے الفاظ سبھی، نیند سے جاگ اٹھے ہوں
اور ہر حرف، تیرے نام کا بیدار ہوا
یوں چمکنے لگا جیسے کہ دیوالی کا چراغ

یوں لگا جیسے اماوس کی سیہ رات کوئی
روزِ روشن کی طرح پھر سے نکھر آئی ہو

یہ تیرے نام کا جادو تھا، مگر مجھ کو لگا
نیلے عنبر سے کوئی لال پری
دبے قدموں مرے آنگن میں اتر آئی ہو

نیلے عنبر سے اتر آئی ہوئی لال پری
آ مرے پاس، مرے پاس، ذرا پاس مرے
آ مرے پاس کہ میں پھر سے پکاروں تجھ کو
پھر سے دہراؤں وہی چند حروف
جن میں جادو ہے

غزل

چند سانسوں کا سہارا دیر تک
کیا ہمارا، کیا تمہارا دیر تک

بس تری نظر کرم کا انتظار
اور کیا کرتا بچارہ دیر تک

لیجئے ناکامیٔ الفت سے بھی اپنے سبق
عشق مت کیجے دوبارہ دیر تک

رہگزر پر تھک کے آنکھیں سو گئیں
راستہ دیکھا تمہارا دیر تک

ایک صحرائے مصیبت تا نظر
ڈھوڈھتے رہئے کنارا دیر تک

چند سکوں کی کھنک کے واسطے
مرتا ہے غربت کا مارا دیر تک

وقت کے نمرود کو، شداد کو
مت کرو آصفؔ گوارا دیر تک

وہ بستیاں

مجھے وہ بستیاں آواز دیتی ہیں

جہاں اکثر

نظر آتی ہیں ہر جانب

گزشتہ صحبتوں کی ان گنت رنگین تصویریں

جدائی کے کھنڈر

مہر و وفا کے آئینہ خانے

جہاں کی وادیاں لفظوں کے پھولوں سے مہکتی ہیں

جہاں بے جان اشیاء بات کرتی ہیں

فضاؤں میں

خیالوں کے پرندے رقص کرتے ہیں

جہاں نیندوں کی پریاں پاس آ کر لوٹ جاتی ہیں

سلگتی جاگتی آنکھوں کا کوئی بس نہیں چلتا

جہاں راتوں کو بھی سورج نہیں ڈھلتا

جلیس نجیب آبادی
پٹھان پورہ، نجیب آباد
موبائل: 9837401782

مٹی کا قرض

اے وطن

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

تجھ سے رشتہ مرا

رشتۂ جسم و جاں

میرے بچپن، جوانی، بڑھاپے کا اک ایک پل

تجھ سے منسوب تھا

ذرہ ذرہ مقدس زمیں کا تری

میرا محبوب تھا

میرا محبوب ہے

تجھ سے وابستگی کا گماں

میرا سرمایۂ قلب و جاں

یہ مرا جسم خاکی

تری پاک مٹی سے مانگا ہوا قرض ہے

ایک دن

تیری مٹی میں مل جائے گا

اظہار وارثی
برہمنی پورہ، بہرائچ
موبائل: 9454896282

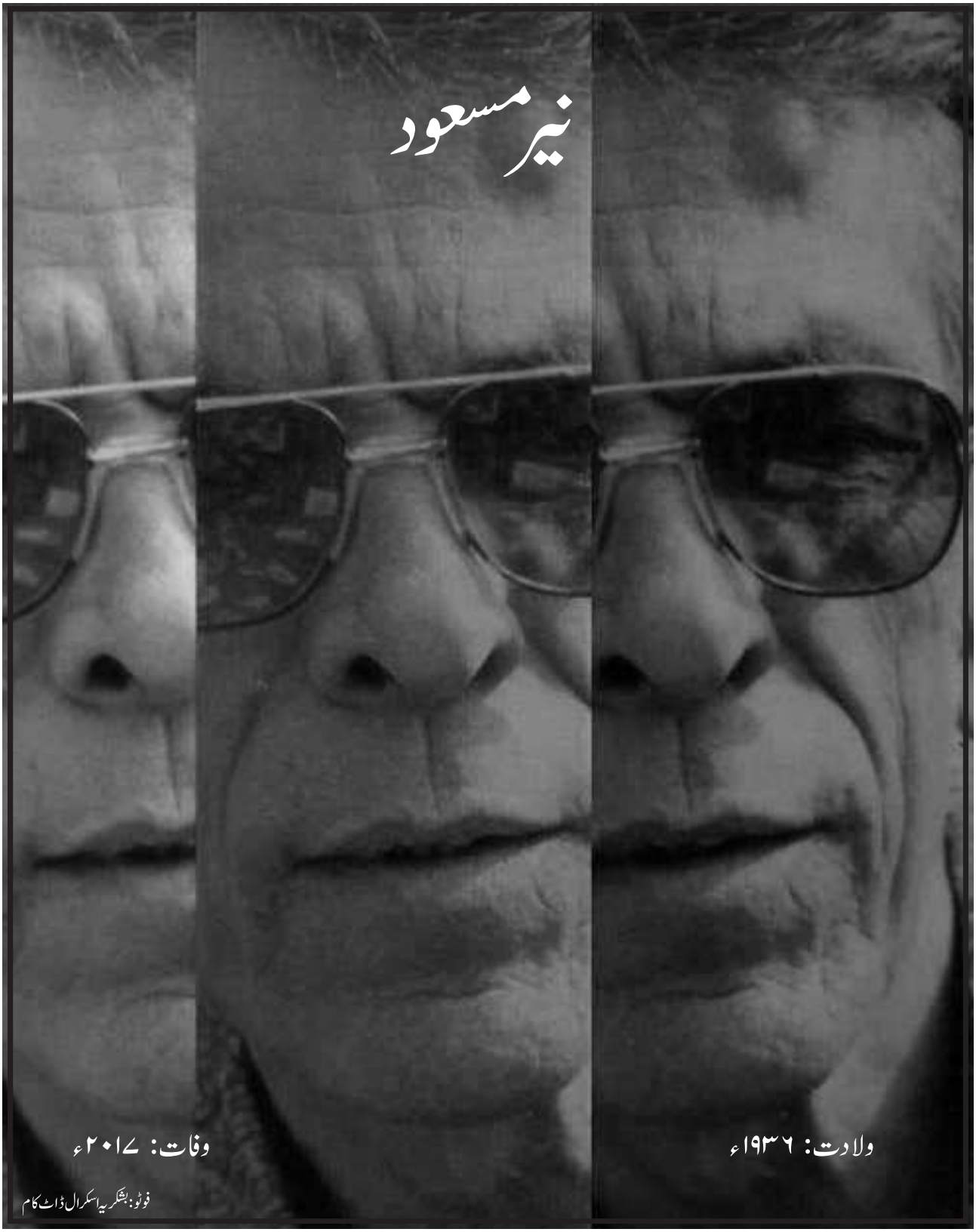
نیر مسعود
ولادت: ۱۹۳۶ء
وفات: ۲۰۱۷ء
فوٹو: بشکریہ اسکرال ڈاٹ کام

خواب میں آتی تھی کہانیاں: نیر مسعود

نیر مسعود صاحب سے انٹرویو کرنے کا ہمیں دو مرتبہ شرف حاصل ہوا۔ پہلی مرتبہ ۲۰۰۲ء میں جب دہلی سے شائع ہونے والی مشہور میگزین 'آؤٹ لک' میں مجرے پر کوراسٹوری شائع ہوئی تھی۔ دوسری مرتبہ جب سرسوتی سمان سے نوازے جانے کے موقع پر اردو ماہنامہ 'آج کل' میں نیر صاحب پر شائع گوشہ کے لئے ۲۰۰۸ء میں انٹرویو کرنے کا موقع میسر آیا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے تفصیل سے بتایا تھا کہ کہانیاں انہیں خواب میں آتی ہیں۔ ادب کے نوبل انعام سے سرفراز عربی زبان کے مشہور و معروف افسانہ نگار نجیب محفوظ کی تقریباً سو کہانیوں پر مبنی ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ یہ تمام تر کہانیاں انہیں خواب میں ہی آئی تھیں۔ خوابوں کو تحریر میں اتار دینے کی اور بھی مثالیں ہیں لیکن کہانی کا خواب میں وارد ہونا نجیب محفوظ کے بعد شاید نیر مسعود کے یہاں ہی پایا جاتا ہے۔ نیر مسعود صاحب کو خراج تحسین کے طور پر ان دونوں انٹرویو کے اقتباسات از سر نو شائع کئے جا رہے ہیں۔ ایڈیٹر

آپ نے علم وادب کے ماحول میں آنکھ کھولی، پرورش اور تربیت ایسے ماحول میں پائی جس میں شعروادب رچا بسا تھا لیکن تخلیقی سفر آپ کا شروع ہوتا ہے عمر کے اواخر میں، ایسا شاذونادر ہی ہوا ہے کیونکہ تخلیقیت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے کسی میں۔ آپ کے ساتھ کیا وجہ رہی کہ بطور افسانہ نگار اس قدر دیر میں منظر عام تک آئے۔

کہانی تو جیسا کے آپ کو معلوم ہے کہ بچے کہانیاں اور نظمیں لکھنا شروع کرتے ہیں میں نے بھی بچپن میں بہت کہانیاں لکھیں کچھ چھپیں بھی پھر بعد میں جوانی کے شروع میں باقاعدہ لکھنا شروع کیا پھر اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ پسند نہیں ہیں یہ کہانیاں۔ بلکہ دو تو اب بھی رکھی ہیں میری کچی رائٹنگ میں۔ چھپوایا نہیں۔ اب بھی پڑی ہوئی ہیں۔ تو کہانیوں کا ہی رجحان تھا اور کہانی ہی زیادہ پڑھتا تھا لیکن گھر میں ساری علمی کتابیں تھیں تو وہ بھی پڑھتا رہتا تھا۔

والد صاحب سے ہی تربیت ملی انہوں نے ہی نثر لکھنا سکھایا۔ کیا گرہوتے ہیں اس کے، ادب کی تاریخ وغیرہ کے بارے میں ان سے معلوم ہوتا رہا پھر شروع کیا افسانہ لکھنا۔ جیسے کہ لکھا ہی نہیں پھر جو لکھا تھا کاٹ پیٹ دیا۔ پھر پی ایچ ڈی کرنے لگا اردو میں پھر فارسی میں تو اس دوران افسانے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ پی ایچ ڈی وغیرہ سے فرصت کے بعد پھر لکھنا شروع کیا اس وقت جو مبہم افسانے لکھے جا رہے تھے تجریدیت قسم کے جدیدیت کے زیر اثر مجھے پسند نہیں تھے۔ شمس الرحمان فاروقی سے بات ہوتی رہتی تھی تو شب خون کے لئے پانچ کہانیاں لکھیں شب خون میں ساری کہانیاں چھپیں۔

تحقیق وتنقید بھی لکھتا رہا بلکہ وہ زیادہ لکھی۔ تنقیدی اور تحقیقی تقریباً دو سو مضامین لکھے۔ کہانیاں تو ابھی پچاس بھی نہیں لکھی ہیں لیکن لکھتا رہا۔ کچھ بہت اچھے ادیبوں نے حوصلہ افزائی کی۔ خاص طور پر محمد سلیم الرحمن تھے مظفر علی سید تھے، انتظار حسین تھے ان سب نے حوصلہ بڑھایا اور سب سے بڑھ کر کہ محمد عمر میمن کو دلچسپی پیدا ہوگئی تو انہوں نے ترجمے کئے بہت سی کتابوں کے اور افسانوں کے۔ تو تب سے ایک سلسلہ بن گیا۔

پہلے تو اوسط ایک سال میں ایک افسانے کا تھا اس کے بعد بیمار ہو گیا تو یہ اوسط بڑھ گیا بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اب جب طبیعت ٹھیک نہیں تو زیادہ افسانے لکھ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس سے اندازہ ہوگا کہ وہ کیسے افسانے ہوں گے کہ وہ جو ایک افسانے پر سال بھر تک محنت کرے اور ایک افسانہ دو مہینے میں لکھ دے تو اس کے بعد ہلکے افسانے ہیں لیکن بہر حال ان کو پسند کیا گیا۔

آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ کہانی مجھے خواب میں آتی ہے۔

ہاں، خواب میں بہت آئیں کہانیاں، اب وہ سمجھ میں نہیں آتا تھا بلکہ میں ڈرتا رہا کہ خواب میں ایسا تو نہیں کے کوئی پڑھی ہوئی کہانی دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تو بڑی محنت سے لکھی اور لوگ کہیں کہ چوری کی ہے مگر خیر ابھی تک چوری پکڑی نہیں گئی ہے۔.....!

پہلی کہانی ''نصرت'' تو پوری کی پوری کی پوری خواب میں آئی تھی۔ مطلب اختتام سمیت، اس کے بعد ''سلطان الظفر کا واقعہ نویس'' اور ''ندبہ''۔ ان سب

کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔تو وہ بہت آسان ہوجاتا ہے کہ خواب میں ایک آؤٹ لائن مل جاتی ہے۔اس کے اوپر میں کہانی کو بڑھاتا ہوں۔خوابوں کا بڑا اہم رول ہے میری کہانیوں میں، بلکہ شمس الرحمن فاروقی تو مذاق میں کہتے ہیں کہ پاگلوں کے خواب ہوتے ہیں آپ کے۔علاج کرائیے اپنا،خواب پر کہانیاں لکھنا مجھے آسان معلوم ہوتا ہے۔

گویا کہ الہام.....؟

الہام وغیرہ تو نہیں، اصل میں آئیڈیاز ہیں جو مصنف کے ذہن میں آتے رہتے ہیں۔اب لوگ ڈرامائی باتیں کرنے لگتے ہیں لیکن میں تو کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ روانی میں لکھتا چلا گیا ہوں تو اس کو میں بہت ہوشیاری سے پھر دوبارہ دیکھتا ہوں اور بہت کاٹنا پیٹنا پڑتا ہے اس کو بس کبھی کبھی خیال آجاتا ہے کہ کوئی جملہ بڑھا دیا جائے یا کوئی اور.....لیکن الہام نہیں ہے اور کسی کے یہاں بھی نہیں ہے۔الہام! وہ تو مصنف لکھنے میں بدل دیتا ہے، بہت لوگ کہتے ہیں نا کہ افسانہ تو میں کچھ لکھ رہا تھا لیکن فلاں کریکٹر آگیا اور اس نے مجھ کو پکڑ لیا اور لکھوادی یہ کہانی تو وہ بھی مصنف ہی لکھتا ہے یہ میرے ساتھ بھی بہت ہوا ہے۔مثلاً ''مارگیز'' کہانی ہے۔تو اس میں مارگیز بہت ہی ولین قسم کا آدمی تھا مگر بعد میں چلتے چلتے اس کو مظلوم دکھا دیا۔تو وہی میں نے خود اپنا پلان بدل دیا۔اب اس کو یوں کہا جائے کہ نہیں صاحب بیچ میں مارگیز آگیا اس نے زبردستی لکھوانا شروع کردیا ایسا نہیں ہے۔

تو کیا کردار گڑھتے ہیں آپ؟ یا خود بہ خود ذہن میں آتے رہے ہیں کردار کیسے اس کو بیان کرنا چاہیں گے۔آپ کے نزدیک بہتر صورت کیا ہوتی ہے افسانہ نگار کے لئے؟

کریکٹر تو گڑھنا پڑتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو آس پاس کے ہیں دوستوں کے ہیں، کچھ ملتے جلتے ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ہمارا گھر جو ہے وہ نئے اور پرانے لکھنؤ کے بیچ میں ہے تو ہمارے آس پاس کریکٹرس بہت سے ہیں۔بھانڈوں کا پورا محلہ ہے یہاں طوائفیں رہتی تھیں، خانگیاں رہتی تھیں۔ان سے ملاقاتیں بھی ہوئیں دوستوں کے ذریعہ،شیشہ گر تھے یہاں، مجھے یاد ہے کہ وہ قارورے کی شیشیاں بناتے تھے اب سب ختم ہوگیا۔بہت پہلے کی چیزیں ہیں یہ،تو وہ پھونکتا تھا انکو۔جیسے غبارے بناتے ہیں صابن سے، بہت شوق سے دیکھتا تھا میں اس منظر کو۔''شیشہ گھاٹ'' کہانی شیشہ گر کے اوپر ہے وہ کریکٹر تو زندگی سے آتے ہیں لیکن عام حالات سے وہ الگ ہوتے ہیں۔تو اس کی وجہ سے محسوس ہوا کہ انوکھے لوگ ہیں کریکٹر سب زندگی کے ہیں اور ٹائم بھی یہی ہے۔وہ جو کہا جاتا ہے کہ میری کہانیاں ٹائم لیس ہیں مگر ٹائم لیس تو ممکن نہیں لیکن اس میں واضح طور پر بنایا نہیں گیا کہ فلاں زمانے کا وقت ہے یا فلاں سن کی کہانی ہے یہ۔

اس کا مطلب کردار تراشی کے قائل ہیں آپ؟

ہاں کردار تراشی کے قائل ہیں، مگر اس میں کسی کردار کا لباس وغیرہ صورت شکل نہیں ہوتی میرے یہاں۔بہت ہلکا سا کہیں ہوگا ورنہ کرداروں کے لباس کی تفصیل نہیں ہے بس ان کی گفتگو سے تراشتے ہیں اور خاص زور کردار نگاری پر دیتا بھی نہیں ہوں۔سب ملا کر ایک چیز بنا دیتا ہوں۔واقعات، کردار کس طرح شروع اور ختم۔بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میری کہانی الٹی طرف سے پڑھی جائے تو بھی ویسی ہی لگے گی۔یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح ہوسکتا ہے لیکن یہ کہ باقاعدہ اس کا خاتمہ اور ابتدا ہوتی ہے۔

شب خون میں آپ نے ایک فارسی کہانی کا ترجمہ چھپوایا تھا اور بعد میں آپ نے کہا کہ وہ میری کہانی ہے۔تو کیا بھروسہ نہیں تھا اپنے اوپر اور اس قدر اعتماد کی کمی تھی۔

ہاں اعتماد کی بہت کمی تھی،نصرت جو میری پہلی کہانی ہے تو ایک فرضی نام سے فاروقی صاحب کو دی۔انہوں نے پسند کی اور کہا چھاپ دیں گے۔مصنف کون ہے پوچھا تو میں نے کہا پتہ نہیں ''زویا نیچ'' نام بتا دیا۔تو انہوں نے کہا کہ یہ تو پولینڈ کا سا نام ہے لیکن پولینڈ کی کہانیوں کا انداز نہیں ہے یہ تو میں نے بتایا کہ میں نے ہی لکھی ہے۔شروع میں پہلی کہانی سے اعتماد بہت کم تھا۔ڈر تھا کہ شاید اچھی نہ ہو فاروقی صاحب ناپسند نہ کردیں تو ان سے کہا کہ یہ دوسرے کی لکھی ہے۔

شعر وادب کے پس منظر کے ساتھ ادبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود آپ تخلیقیت کو لے کر اس قدر تذبذب کے شکار کیسے ہوگئے اتنے پس و پیش میں کیسے آگئے تھے۔؟

تخلیق گویا پہلی چیز تھی۔تھوڑی بہت کہانیاں میں لکھتا رہا تھا وہ سب بچپن کی کہانیاں تھیں۔تو اعتماد تو نہیں تھا اپنے اوپر مگر زبان پر خاص محنت کی تھی تو ٹھیک بن گئیں کہانیاں۔

لکھنؤ اور اودھ دونوں کے نمائندہ افسانہ نگار مانے جاتے ہیں آپ۔کیا محسوس ہوتا ہے کہ آپ بھرپور عکاسی کر پائے ہیں یا وہ تہذیب یا تمدن جس کے لئے لکھنؤ جانا جاتا ہے۔کیا وہ سب آپ کے افسانوں میں موجود ہے؟

اب میں کوشش تو نہیں کرتا ہوں مگر چونکہ لکھنؤ ہی میں رہتا ہوں اور لکھنؤ کی تاریخ وغیرہ سے دلچسپی بھی بہت رہی ہے۔پڑھا بھی بہت ہے تو دوسروں کو بہت محسوس ہوتا ہے مجھے تو محسوس ہوتا نہیں یہ مقصد بھی کبھی نہیں رہا کہ لکھنؤ کی تہذیب پر کہانیاں لکھوں یا یہاں کہ تہذیب کو نمایاں کروں۔تحت الشعور یا لاشعور میں لکھنؤ موجود رہتا ہے۔تو لکھنؤ کا عکس آتا ہے۔لوگوں کو بہت محسوس ہوتا ہے۔''طاؤس چمن کی مینا'' کو خاص طور پر لکھنؤ کی کہانی مانا جاتا ہے لکھنؤ زندہ مامعلوم ہوتا ہے اس میں۔حالانکہ میں نے ایسی کوئی نہیں لکھی کہ جس میں لکھنؤ کی Typical لکھنویت جو ہے وہ

ظاہر ہو، مگر تحت الشعور میں جو چیز موجود رہتی ہے وہ آ ہی جاتی ہے۔

لکھنؤ کا ذکر آیا ہے تو لکھنؤ کے مجروں پر بات کرنا بھی شاید غلط نہیں ہوگا۔ مفروضہ ہے کہ شرفاء کے بچوں کو تہذیب و ادب سیکھنے کے لئے لکھنؤ کی طوائفوں کے کوٹھوں پر بھیجا جاتا تھا۔

(تھوڑا سا مسکرائے) جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ بات عبدالحلیم شرر کی مشہور زمانہ کتاب 'گزشتہ لکھنؤ' کے شائع ہونے کے بعد تشہیر پائی۔ طوائفوں کے کوٹھے اس وقت بھی اتنی ہی غلط جگہ سمجھے جاتے تھے جتنا کہ آج۔ یہ بات کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ گئی، یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن میرے خیال سے ایسا کسی بھی زمانے میں ممکن نہیں ہوا ہے۔

کیا آپ نے لکھنؤ کی طوائفوں کے مجرے دیکھے ہیں؟ کیسے ہوتے تھے مجرے؟

(تھوڑی دیر کی خاموشی کو توڑتے ہوئے گویا ہوئے) مجرے تو ہوتے تھے، اچھے مجرے ہوتے تھے، بڑا شہرہ تھا ان کا۔

کیسے ہوتے تھے مجرے، کیا جیسے فلموں میں دکھائے جاتے ہیں ویسے ہی؟

آپ کس فلم کی بات کر رہے ہیں، مجرے تو درجنوں فلموں میں فلمائے گئے ہیں۔

جیسے امراؤ جان میں دکھائے گئے ہیں۔

ہاں، ایسے ہی ہوتے تھے۔

آپ کی ابتدائی کہانیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑی کافکائی قسم کی پر اسرار کہانیاں ہوتی تھیں بعد میں ایک دم سادہ بیانیے پر آ گئے آپ۔ یہ تبدیلی کیسی ہے کیسے آئی۔

میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ تبدیلی آئی ہے مگر لوگوں کو محسوس ہوتا ہے۔ شروع میں تو ہے۔ وہ سب مبہم کہانیاں ہیں وہ ''سیمیا'' کی جو پانچ کہانیاں ہیں۔ لیکن وہی سب سے زیادہ پسند بھی کی گئیں۔

آپ کی کہانیاں زبان و بیان اور اسالیب کے اعتبار سے اچھی ہوتی ہیں لیکن انکا موضوع گنجلک اور مبہم ہوتا ہے۔

میں موضوع کے بارے میں سوچتا ہی نہیں ہوں اور موضوع رکھا نہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کہانیاں مبہم ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہانی میں آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ ضمنی موضوعات بہت سے ہوتے ہیں لیکن بنیادی موضوع کوئی ایک نہیں ہوتا۔ بعض کہانیوں میں ہے لیکن عام طور پر کہانیوں موضوع نہیں ہے۔ ضمناً تمام موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کو چاہیں میری کمزوری سمجھ لیجئے کہ موضوع بنا کر کہانی نہیں لکھ پاتا ہوں۔ اب جیسے کہ طاؤس چمن کی مینا کا موضوع بتا سکتے ہیں آپ؟ انگریزوں کا یہاں قبضہ دھیرے دھیرے ہو رہا ہے۔ لیکن وہ بھی بنیادی موضوع نہیں ہے اس کا۔ افسانے کی بنت میں آ جائے گا وہ سب۔ تو وہی بلکہ الزام ہے کہ جب موضوع سمجھ میں نہیں آتا تو افسانہ کیا ہوا وہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ موضوع نہیں ہوتا۔

نویں دہائی کے اوائل میں آپ کہانی ''رے خاندان کے آثار'' چھپی تھی، اسے ایک ٹرننگ پوائنٹ مانا جانے لگا کیا آپ متفق ہیں اس سے یا کوئی اور بات ہے۔

میں تو اس حد تک متفق ہوں کہ اس میں سہل انگاری آ گئی مطلب زیادہ محنت نہیں کر پاتا ہوں افسانوں میں۔ تو وہ پیچ وغیرہ نہیں ہے ان میں۔ لیکن ٹرننگ پوائنٹ تو مجھ کو تو یہ محسوس ہوا کہ آیا ہے خاص طور پر سیمیا کی کہانیوں سے، سہل انداز رکھا ہے اپنا۔ اب رے خاندان کے آثار میں وہ خاتون جو انجلا رے ہیں وہ یہیں ہمارے یہاں آتی تھیں پڑھتی تھیں۔ وہ بھی کریکٹر یہیں لکھنؤ کے ہیں۔ تو یہ لکھنؤ کے سارے کریکٹر آتے ہیں اس شہر کی کہانیاں ہیں لیکن خاص طور پر اس شہر کی کہانی نہیں لکھی ہے۔ ایک اور خیال رکھا ہے کہ استعارہ اور علامت نہ آنے پائے کہانی میں۔ اب کوئی کہانی بن کے علامتی مفہوم نکالا جا سکتا ہے لیکن میں نے علامتی کہانی تو شاید لکھی نہیں، استعارہ تو تقریباً ہے ہی نہیں۔

میرے یہاں تشبیہ ہوگی بہت لیکن استعارہ نہیں۔ استعارہ کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے کہ جو چیز ہے اس کو کچھ اور بتائیں استعارہ شاعری کے لئے مناسب ہے نثر کے لئے نہیں۔ استعارہ میں ٹھیک سے ترسیل نہیں ہو پاتی۔ حالانکہ نثر میں افسانے میں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اچھی طرح سے بھی استعمال ہوتا ہے لیکن میں نے استعارہ کا استعمال کبھی نہیں کیا۔ مثلاً کسی افسانے میں کہا گیا ہے کہ سواری کے پیچھے پیچھے سڑک پر کالا ربن کھلتا چلا جا رہا تھا تو یہ استعارہ ہے اسے میں لکھوں گا تو اس طرح کہ سڑک کالے ربن کی طرح کھلتی چلی جا رہی تھی۔ تو اسے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔

آپ نے فرمایا کہ پہلے آپ کہانی پر زیادہ کام کرتے تھے اب کم کام کر پاتے ہیں لیکن پڑھنے والے تو کہتے ہیں کہ اب کی کہانیاں زیادہ بہتر ہیں۔

اب وہ تو پڑھنے والے زیادہ معتبر ہیں۔ میرا کیا جیسا بھی لکھتا ہوں۔ میں نے شعوری طور پر نہ سہل لکھنے کی کوشش کی اور نہ مشکل کی۔ جو میرا نیچرل اسٹائل ہے اسی میں لکھتا ہوں۔ بس یہ کہ پیور اور خالص نثر ہونا چاہئے میں۔ شعر کے اوزار سے کام نہیں لیتا ہوں۔ بہت سے لوگ لکھتے ہیں ان کی رنگین عبارتیں ہوتی ہیں۔ قاضی عبدالستار ہیں جیسے ان کے یہاں تمام استعارے بھی ہیں اور علامتیں بھی ہیں۔ صاحب طرز لکھنے والے ہیں۔ اس کو برا نہیں کہہ سکتے ہم، بس یہ کہ ہماری طبیعت اس طرف نہیں آئی۔

سیمیا سے طاؤس چمن کی مینا تک کا سفر کو کیا ارتقا مانتے ہیں؟

یہ قاری بتائیں گے میں جو لکھ رہا ہوں بس لکھ رہا ہوں، ارتقا سمجھیں یا زوال یہ تو قاری پر ہے۔ اس کو کیا محسوس ہوتا ہے وہی ٹھیک بھی ہوتا ہے۔ اگر قاری با

ذوق ہے تو اس کا جو احساس ہوگا وہ زیادہ صحیح ہوگا ۔میں نہ قاری کو خوش کرنے کے لئے لکھتا ہوں اور نا ناراض۔ میں اتنی چیزیں نہیں سوچتا افسانے میں پھر بھی دو تین تہیں ہوجاتی ہیں ۔اب اس کو زوال کہئے یا ارتقا۔

آپ کو اپنے افسانوں کا سب سے پسندیدہ اور نمائندہ کردار کون سا لگتا ہے۔

سب سے پسندیدہ کہانی تو سیمیا ہی ہے۔ اس کا کردار مالک جو ہے وہ جو محل کا مالک ہے وہ اچھا معلوم ہوتا ہے عطر کافور میں ماہِ رخ سلطان جو ہیروئن ہے وہ کردار پسند آیا۔ میری کہانیاں کرداروں پر منحصر نہیں ہیں تو کسی کردار پر زیادہ محنت، اس کو ابھارنے کی کوشش نہیں کرتا ہوں۔ کہانی کی بنت میں ہوتا ہے کردار۔ سیمیا کا مالک کا کردار ہے وہ بہت پیچیدہ کردار ہے۔

آپ کو اب تک سب سے زیادہ کس کردار نے متاثر کیا ہے وہ کون سے کردار ہیں جن کو آپ واقعی کردار مانتے ہیں میری مراد آپ کے افسانوں کے کرداروں سے نہیں ہے۔

ایڈگر ایلن پو کی ''فال آف دہ ہاؤس آف اشر'' اس میں دو کردار ہیں ایک اشر جو ہیرو ہے اور اس کی بہن جس کو اس نے دھوکے میں دفن کر دیا تھا فلابیر کی کہانی ''سلامبو'' اس میں ہانو کا کردار بہت اچھا لگتا ہے مجھے اور اس کا ہیرو ٹائپ ہے ماتو وہ تو بہت زبردست استاد تھا۔ بڑی محنت سے لکھتا تھا کردار۔ اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ کردار کی شکل وصورت اور لباس نہ بیان کرو۔ وہ تو وکٹر ہیوگو کا استاد تھا ایک طرح سے۔ مچھلی کے بازار میں لے کر گیا اس کو کہ اس میں ایک مچھیرن چھانٹ لو اور اس کا discription بیان کرو یہ نہ بتاؤ کہ کیا پہنے تھی اس کی صورت کیسی تھی۔ پھر میں دیکھوں گا بازار میں اگر میں پہچان لوں تو تم نے ٹھیک لکھا ورنہ پھر سے لکھوں۔

یہی کوشش میں نے بھی کہ کرداروں کی تفصیل نہ بیان کی جائے لیکن یہ کوئی خوبی نہیں ہے افسانے کی۔ اپنے اپنے پسندیدہ انداز میں کچھ افسانہ نگار اسے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

کرداروں کی جہاں تک بات ہے تو جیمس ہیڈلی چیز کے کردار کا بھی اثر ہے مجھ پر۔ کچھ لوگ شرماتے

ہیں بتانے میں لیکن لیکن سچ یہی ہے۔ چیئز کا کردار کیٹ کا کردار جو فوٹو گرافر تھا وہ بھی بہت پسند ہے مجھے۔ ووڈ ہاؤس کا کردار بھی بہت پسند ہے۔

اردو کی بات کریں تو عظیم بیگ چغتائی، رفیق حسین، غلام عباس، حیات اللہ انصاری کا اور انتظار حسین، انتظار حسین کی تو کوئی نقل نہیں کر سکا میں بھی نہیں کر پایا لیکن انتظار حسین سے بہت متاثر ہوں۔

اردو میں کوئی کردار جو متاثر کر سکا؟

حیات اللہ انصاری کی کہانی آخری کوشش اس کا گھسیٹے بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے کرشن چندر کا ''گلشن گلشن ڈھونڈا تجھ کو' اس کا ہیرو کا کردار بھی اچھا بنایا انہوں نے۔ یہ سب یاد رہ جانے والے کردار ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں کیا خیال ہے خاص طور پر گردش رنگ چمن اور چاندنی بیگم کے پس منظر میں۔

وہ تو بہت بڑی لکھنے والی تھیں۔ انہیں اب تک سمجھا نہیں گیا۔ ٹھیک سے۔ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہے۔ مظفر علی سید کہتے ہیں کہ اچھا لکھتی ہیں لیکن گڑیا پن ہے ان میں۔ آخیر میں کچھ میلو ڈراما کر دیتی ہیں وہ۔ لیکن بہت بڑی افسانہ نگار تھیں۔ بڑی محنت کرتی تھیں اپنے افسانوں میں میرے پاس کئی خط ہیں ان کے لکھنؤ کے بارے میں خاقان منزل کے بارے میں پوچھا کہ کن لوگوں کی تھی۔ یا یہ کہ کیا آپ نے پڑھا ہے کہ سعادت علی خاں کے مقبرے میں عیسائی رسمیں ہونے لگی تھیں۔ وغیرہ۔ تو وہ بھی خاص زور نہیں دیتی تھیں by the way ذکر آتا تھا۔ لیکن پیچھے اس کی تاریخی حقیقتیں ہوتی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی سب سے بڑی افسانہ نگار اور ناولسٹ وہی تھیں۔

ان کی کردار سازی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کردار بھی بنائے ہیں لیکن کرداروں پر بہت زور نہیں دیا ہے انہوں نے۔ خاص طور پر کردار کو نمایاں کرنے کے لئے لکھ رہی ہیں۔ افسانے کے اندر آجاتے ہیں کردار اور ان کے نمایاں خصوصیات واضح ہوجاتے ہیں۔ میرے بھی صنم خانے کا پیچو کردار مجھے پسند ہے۔ عارف میاں کا کردار مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ اس پر اعتراض بھی ہوا کہ یہ کیا سوجھی انہیں ان کی مرید ہوگئیں۔ میں بھی واقف ہوں عارف میاں سے تو بالکل صحیح کردار دکھایا ہے انہوں نے۔ بہادر لکھنے والی تھیں۔ بالکل شرمائی نہیں لکھنے میں۔ عارف میاں کے سامنے بالکل دو زانوں ہوکر بیٹھتی تھیں سر ڈھانپ

کے۔ان کے گھر جاتے بھی تھے ۔ وہ ڈانٹ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کا کام تھا قرۃ العین کی سفارش مطلوب تھی۔ عارف میاں سے کہا گیا انہوں نے کہا کرے گی کیسے نہیں اور قرۃ العین حیدر نے وہ کام کر دیا۔مصنف کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔جیسے وہ تھیں۔

نئے لکھنے والوں میں کون ہے جس نے آپ کو متاثر کیا۔

شاہد اختر اچھا لکھ رہے ہیں خالد جاوید بہت اچھا لکھ رہے ہیں اور لوگ بھی ہیں لیکن اتنا ابھی متاثر نہیں کر پا رہے ہیں شاہد اختر اور خالد جاوید یہ دو لوگ جو ہیں اس میں خالد جاوید سے بہت امیدیں ہیں وہ خاصے پڑھے ہوئے ہیں فلسفہ کے آدمی ہیں تو ان سے امید ہے اور بہتر لکھیں گے۔

بشمول پاکستان نئے افسانہ نگار کون ہیں جو عالمی ادب میں کوئی مقام بنا سکتے ہیں۔

آصف فرکی اچھا لکھ رہے ہیں ۔بالکل نئے لوگوں کے بارے میں مجھ کو کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ اردو افسانہ عالمی افسانے سے آنکھ ملا سکتا ہے۔ایسا بھی نہیں ہے مثلاً شموئیل احمد اور غزال ضیغم کے بارے میں کیا خیال ہے۔

شموئیل احمد نے کئی چیزیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ پیغام آفاقی بھی اچھا لکھتے تھے لیکن کم لکھ رہے ہیں۔ یوں تو مشرف عالم ذوقی بھی لکھ رہے ہیں۔ سید محمد اشرف بھی اچھا لکھتے ہیں۔تو اس وقت یہی سب نام ہیں غضنفر ہیں لیکن یہ سب چالیس پچاس کی عمر کے لوگ ہیں۔غزال بھی بہت کم لکھتی ہیں مگر اچھا لکھتی ہیں ان کی کہانی بھی کچھ چیزیں بہت اچھی ہیں ان کے مجموعہ میں ابھی امکان میں ان کا کوئی افسانہ پڑھا تھا۔ بڑا الجھا ہوا تھا لیکن اچھا ہے۔ترنم ریاض بھی اچھا لکھتی ہیں مگر اعلیٰ ادب میں شمار نہیں ان لوگوں کا۔

اردو میں کوئی ایک نام ہے جس کو اعلیٰ ادب میں شمار کیا جا سکے۔

انتظار حسین ہیں یا پھر صحیح معنی میں عالمی پس منظر میں دیکھیں تو سعادت حسن منٹو ہیں۔

منٹو سے ایک بات یاد آئی کہ وہ ایک لفظ بھی غیر ضروری نہیں لکھتے تھے۔آپ کیلئے بھی کم و بیش یہی تاثر ہے آپ کے افسانوں میں آپ نے بھی کہا کہ کہانی پر آپ بہت محنت کرتے ہیں۔

میں بھی زائد چیزوں کو نہیں رکھتا ہوں بلکہ بہت سی چیزیں ان کہی چھوڑ دیتا ہوں کہ پڑھنے والا خود کو سمجھ لے گا منٹو کے یہاں تو کمال تھا۔ بیدی کے یہاں بھی یہی خصوصیت تھی۔ زبان پر خاص محنت کرتے تھے کہتے بھلے نہ ہوں۔

فارسی کہانی کا اثر مانتے ہیں آپ اپنی کہانیوں پر۔

فارسی کہانی کا اثر تو نہیں ہے میں نے ترجمے کئے فارسی کہانیوں کے تو ترجمہ کرنے والے کی شخصیت بھی آجاتی ہے تو کچھ پسند بہت ہیں کہانیاں لیکن فارسی کہانی کا اثر کوئی خاص نہیں ہے بابا مقدم نے بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں۔ترجمے کئے ہیں میں نے لیکن افسانے سے متاثر اس طرح نہیں ہوں کہ ان کی جھلک دکھے۔

Magic realsim سے کیا آپ نے استفادہ کیا ہے۔اپنے یہاں پاتے ہیں؟

میں تو ٹھیک سے سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے لوگ ذکر کرتے ہیں میں نے کوئی خاص کوشش نہیں کی بعض چیزیں آجاتی ہیں۔ جیسے مابعد الطبیعات آجائے گی۔ رکشہ والے کی گفتگو میں آجاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کا اسکپرٹ ہے میں نے مابعد الطبیعات پڑھی ہے ایک بار رکسال کی کتاب لایا لیکن سمجھ میں نہیں آئی۔ عام گفتگو میں مابعد الطبیعاتی باتیں آجاتی ہیں۔

آپ کی کہانیوں کے بارے میں عام خیال ہے کہ آپ کچھ کہتے نہیں ہیں کہانی میں پڑھنے والا خالی ہاتھ رہ جاتا ہے؟

یہ تو پرانی شکایت ہے۔اب بھی نہیں کہتا ہوں۔ لوگ پوچھتے بھی ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں تو بھی میں نہیں بتاتا ہوں نہ کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہوں پڑھنے والے کی جو سمجھ میں آئے وہ ٹھیک ہے۔

❑❑❑

'نیادور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیادور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ در اصل اردو کے فروغ کا ہے۔اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہر حال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Crossed Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔

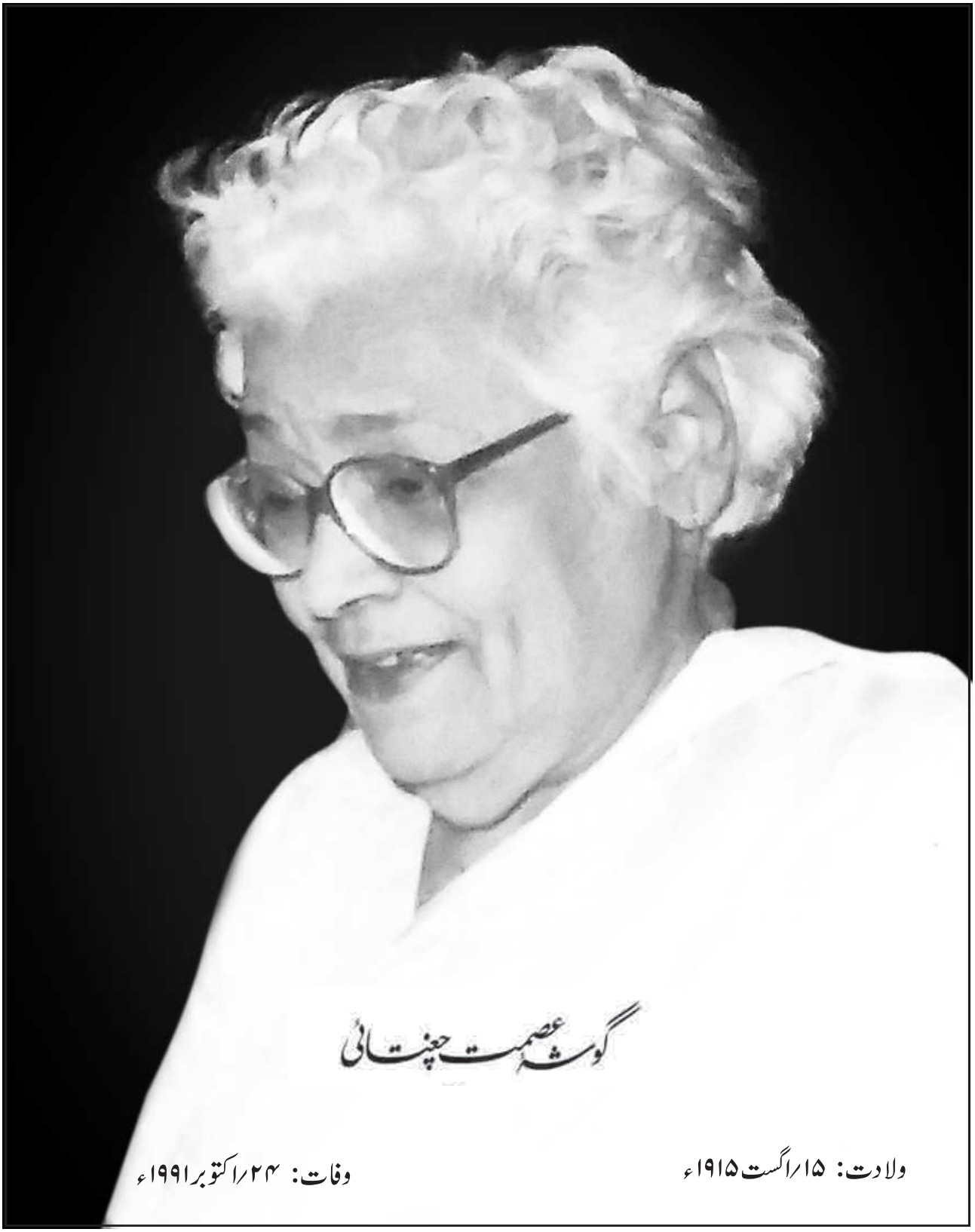
گوشۂ عصمت چغتائی
ولادت: ۱۵/اگست ۱۹۱۵ء
وفات: ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۱ء

ذہین تیز آنکھوں والی عصمت آپا

قاضی عبدالستار
4/1082، سرسید نگر، علی گڑھ
موبائل: 7417780295

عصمت چغتائی جن کو میں عصمت آپا کہتا تھا علی گڑھ اکثر آیا کرتی تھیں ان کی ایک عزیزہ پرنسپل ٹریننگ کالج کی بیگم تھیں وہ انہیں کے یہاں مقیم ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۵۶ میں جب رشید صاحب (پروفیسر رشید احمد صدیقی) شعبہ اردو کے چیئرمین تھے۔ عصمت آپا تشریف لائیں تو رشید صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک ادبی محفل کا انعقاد کیا۔ میں اسٹاف میں آچکا تھا۔ کیوں کہ سب سے جونیئر تھا اس لیے میزبانی کے آداب بجالانے میں پیش پیش تھا۔ عصمت آپا نے کوئی افسانہ پڑھا جس کا نام مجھے یاد نہیں۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو ان کے شوہر شاہد لطیف بھی ان کے ساتھ آئے تھے۔ ڈاکٹر علیم صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس افسانہ کا نام 'دو ہاتھ' تھا۔ تو اس محفل میں انہیں پہلی بار میں نے دیکھا اور غور سے دیکھا۔ اچھا قد کھلتا ہوا گندمی رنگ، بھرا ہوا بدن، ذہین تیز آنکھیں، مغرور چہرہ۔ ہر چند وہ مسکرا کر باتیں کرتی تھیں لیکن ان کی ہر ادا پر تبختر نثار ہو رہا تھا۔ پروفیسر مونس رضا جو اس وقت لکچرر تھے، ان سے کچھ زیادہ قربت کا اظہار کر رہے تھے۔ آپا نے مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھا اور محفل برخاست ہوگئی۔

چند برس بعد ایک فون ممبئی سے ڈین فیکلٹی آفس میں آیا جو عصمت آپا کا تھا اس اطلاع کے ساتھ کہ میں پرسوں آرہی ہوں۔ شام کو اپنے گھر پر رہنا۔ اس بار آپا تنہا تشریف لائیں۔ میں اس زمانے میں 'راوی' نام کی انجمن قائم کر چکا تھا اس لیے اپنی قیام گاہ، آنند بھون کے ڈرائنگ روم میں چھوٹی سی محفل منعقد کر لی۔ آپا نوجوان لکھنے والوں سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور فرداً فرداً سب سے باتیں کرتی رہیں۔ آج مجھے پتہ بھی نہیں کہ انوار علیگی، تنویر نیر، مسعود برنی، کرن جوہر اور اختر آراء وغیرہ کہاں ہیں۔ خدا کرے جہاں ہوں خوش و خرم ہوں۔ یہ محفل دس بجے رات تک رہی اور ایک یادگار نوٹ پر ختم ہوئی۔

تیسری بار جب وہ تشریف لائیں تو داراشکوہ کی شہرت آسمان پر تھی۔ آتے ہی آتے انہوں نے مسعود محل میں بہت بڑی محفل کا انعقاد کیا۔ اس محفل کی خصوصیت یہ تھی کہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب اور پروفیسر نورالحسن صاحب (وزیر تعلیم) کے اسرار پر آپا نے بہت انکار کے بعد صدارت قبول کر لی۔ مجھے حکم ہوا کہ میں داراشکوہ سے ساموگڑھ کی پوری جنگ پڑھوں۔ آپا نے خطبہ صدارت میں بہت زور دے کر فرمایا کہ داراشکوہ اردو کی پہلی کتاب ہے جس میں ایک مشہور جنگ پوری آب و تاب کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ان کا یہ جملہ بہت دنوں تک علی گڑھ کی ادبی محفلوں میں گونجتا رہا، اس لحاظ سے بھی یہ محفل یادگار تھی کہ اس کے علاوہ آپا نے کبھی کسی محفل کی صدارت قبول نہیں کی۔ تھوڑے دنوں بعد آپا کا ایک خط آیا کہ کمال امروہی سنیما کی دنیا کا بہت بڑا نام ہے تم کو کمال نے دو خط لکھے تم نے کسی کا جواب نہیں دیا۔ انتہائی بری بات ہے۔ اب میں خود تمہاری گوشمالی کے لیے آرہی ہوں۔ میں نے پھر ان کے لیے ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ آپا نے بھری محفل میں فرمایا کہ کمال امروہی رضیہ سلطان بنا رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تم ممبئی آؤ اور رضیہ سلطان کا اسکرپٹ زبان و بیان دیکھو اور جہاں ضرورت محسوس کرو درست کرو جس کا تمہیں معقول معاوضہ ملے گا۔ میں نے جواب دیا آپا آپ حکم دیں تو اپنی جیب سے ممبئی آؤں، اپنے کسی شاگرد کا مہمان ہو جاؤں، کمال صاحب جو خدمت میرے سپرد کریں وہ سرانجام دوں لیکن اگر کمال امروہی مجھے بلا رہے ہیں تو پہلے پچاس ہزار روپیہ بھیجیں، ریل کے دو ٹکٹ بھیجیں، ہوٹل کا نام اور کمرے کا نمبر بھیجیں اور میری یہ شرط بھی مانیں کہ میں دس بجے سے چار بجے تک ہی ان کے آفس میں بیٹھ سکتا ہوں۔ آپا بہت غور سے سنتی رہیں پھر بولیں یہ نکاح کی شرط ہے کہ فلم کی؟ لڑکے بہت زور سے ہنسے۔ بہرحال آپا نے کمال کی بہت وکالت کی لیکن میں اپنی شرائط پر اڑا رہا اس لیے کہ ہر میش ملہوترا اس سے پہلے مجھے ممبئی بلا چکے تھے اور تاج محل ہوٹل میں میرے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا ساتھ ہی ایک لاکھ روپیہ مجھے دیا تھا۔ میرے دوست ڈاکٹر راہی معصوم رضا بھی پورے وقت میرے ساتھ رہے تھے۔ وہ عصمت آپا سے آخری تفصیلی ملاقات تھی۔ میرا خیال ہے کہ چوراسی پچاسی میں ایک بار آئیں تھیں اور غریب خانہ پر بھی ایک محفل میں قدم رنجہ فرمایا تھا لیکن اب ان پر عمر طاری ہو چکی تھی اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھیں لیکن میں ان کی خدمت میں بار یاب رہا اور ان کی باتیں سن کر افسردہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ آخری ملاقات تھی جو بہت دنوں یاد رہی اور مجھے غمزدہ کرتی رہی۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے وائس چانسلر مصاحد قدوائی سے گفتگو پر مبنی۔

❑❑❑

ٹیڑھی لکیر
ناول ہی نہیں سماجی منشور بھی ہے

شمیم حنفی
B-114، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی۔ ۲۵
موبائل: 9818524803

عصمت چغتائی کی سب سے عمدہ تخلیق آپ کسے مانتے ہیں؟

عصمت چغتائی کا ناول 'ٹیڑھی لکیر' بہت عمدہ ناول ہونے کے علاوہ ایک بہت اہم سماجی منشور بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے ابتدائی ۸۰ صفحات کی مثال ہمیں اردو فکشن کی پوری روایت میں نہیں ملتی۔ جس کھرے پن، جرأت مندی اور حقیقت پسندی کے ساتھ انہوں نے اپنے طبقہ کی مسلمان لڑکیوں کے مسائل اور ان کے نفسیات پر نظر ڈالی ہے، یہ نہ تو ان سے پہلے کوئی کر سکا، اور نہ کوئی ان کے عہد میں کر سکا اور نہ ان کے بعد۔

کیا عصمت چغتائی کو آپ ایک محدود نظریہ کی افسانہ نگار نہیں کہیں گے کیونکہ انہوں نے متوسط طبقہ کی مسلم لڑکیوں کے مسائل کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کے وہاں وہ وسعت نہیں ملتی جو ان کے ہم عصروں میں نظر آتی ہے۔

ہاں، اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عصمت آپا کا وژن بہت بڑا نہیں تھا لیکن ان کے شعور میں تیزی اور بے خوفی بہت تھی، ان کی کہانیاں اور ناول بالعموم ایک مخصوص دائرے میں گردش کرتے ہیں لیکن اسی دائرے میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنی سماجی روایت اور اپنی ادبی روایت، دونوں کے لئے نیا راستہ بنایا۔ وہ زمانہ اردو فکشن کا شاید سب سے سنہرا زمانہ تھا۔ سعادت حسن منٹو، راجیندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے علاوہ اس عہد میں کئی ایسے افسانہ نگار سامنے آئے جو ہندوستان کی کسی بھی زبان سے آگے تھے۔ حیات اللہ انصاری، ممتاز مفتی، غلام عباس۔۔۔۔ یہ معمولی لکھنے والے نہیں ہیں اور کسی بھی روایت کے شایان شان ہو سکتے ہیں۔ عصمت کا کمال یہ ہے کہ وہ ان سب سے الگ اور منفرد نظر آتی ہیں۔ یہ انفرادیت ان کی کہانیوں کے پلاٹ اور ان کی کردار سازی اور سب سے زیادہ ان کی زبان و بیان کی وجہ سے ہے۔

ان کی شہرت میں ان کے متنازعہ کرداروں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

یہ کسی کی رائے ہو سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی انفرادیت میں ان کی کردار سازی کے علاوہ سب سے نمایاں پہلو ان کی زبان و بیان ہے۔ ان کے جیسی زبان اس عہد کے باکمال افسانہ نگاروں میں سے کسی نے نہیں لکھی۔ پطرس بخاری نے عصمت کی انفرادیت کا اعتراف سب سے پہلے کیا تھا۔ وہ انگریزی فکشن کی روایت اور اردو فکشن کی روایت دونوں پر نظر رکھتے تھے۔ عصمت کو عام راستے سے ہٹ کر چلنے کی جو عادت تھی، اس نے انہیں فکشن نگاری میں سب سے الگ راہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ یہی ان کا خاصہ ہے اور یہی ان کی شناخت۔

جرأت اور بغاوت کے اس مرکب کے سماجی پس منظر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ان کی تعلیم و تربیت میں کچھ مخصوص عناصر کارفرما تھے، جو ان کی شخصیت کا خاصہ بن گئے؟

دیکھئے! انہوں نے اپنے بعد والے افسانہ نگاروں کے راستے میں جتنے کانٹے تھے، انہیں سمیٹ لیا، انہیں توڑ دیا۔ غیر معمولی سماجی شعور رکھنے والی مصنفہ تھیں وہ۔ اس زمانے میں انہیں ایسی وراثت نہیں ملی جس کی وہ تقلید کرتیں، وہ اپنے رنگ اور اپنی وضع کی پہلی افسانہ نگار تھیں۔ ان کی شخصیت میں دو باتیں نمایاں تھیں۔ ایک تو بے خوفی اور دوسرے اپنی مرضی سے اپنی راہ اختیار کرنا۔ جس گھرانے میں ان کی پرورش ہوئی، وہ بھی بڑا دلچسپ تھا۔ ایک طرح کا روایتی مسلمانوں کا خاندان جہاں ہر پرانی بات کا احترام کیا جاتا تھا لیکن ان کے بھائیوں میں ایک ایسا بھی تھا جس نے انہیں احتجاج اور بغاوت کے راستے پر لگایا، وہ تھے مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کو عام اردو والے شگفتہ مزاج یا مزاحیہ ادب کے تخلیق کار کے طور پر دیکھتے ہیں لیکن وہ اس کے آگے بھی بہت کچھ تھے۔ ان کا مذہب کا تصور بھی بڑی حد تک انفرادی تھا اور وہ رسومات کے بالکل قائل نہ تھے۔ انہوں جب اپنی بہن میں آزاد فکر کے عناصر دیکھے تو انہیں خوشی بھی ہوئی اور شاید یہ خیال بھی آیا کہ ایک روایتی خاندان میں ایک غیر روایتی لڑکی بھی پیدا ہوئی ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ بہت بڑی بات تھی۔ کیونکہ اس وقت تک لڑکیاں اپنی آواز نہیں اٹھاتی تھیں۔ والدین اور بھائی جو کچھ کہتے تھے، اسے تسلیم کر لیا کرتی تھیں لیکن عصمت تھی کہ انہیں لڑکوں کے کھیل پسند تھے اور اس وقت کی لڑکیوں کے عام چلن سے بڑی حد تک منحرف تھیں۔ انہوں نے خود لکھا ہے کہ بچپن ہی سے یہ خیال بار بار آتا رہتا تھا کہ وہ لڑکوں کے برابر کیوں نہیں ہیں۔

زمانہ بدلا، اس دور کے Taboo ٹوٹے، آزاد خیالی عام ہوئی، انٹرنیٹ نے دنیا کے سامنے وہ سب کچھ رکھ دیا جو عصمت آپا کے زمانے میں صرف

تصور تک محدود تھا، لیکن اب بھی عصمت چغتائی کے کرداروں کا Relevance کم نہیں ہوا۔

دیکھئے! ان کے زمانے سے ہمارا زمانہ بہت آگے بڑھ گیا۔ نئے مسائل کی سوغات لے کر آیا ہے لیکن یہ نئے مسائل بھی اپنی نئی روایت کے لحاظ سے ہمیں بار بار عصمت کی طرف دیکھنے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں۔ اچھے فکشن کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لکھنے والا کرداروں کے انتخاب میں بالکل آزاد خیال ہو۔ وہ صرف رول ماڈل قسم کے کرداروں کے پھیر میں الجھ کر نہ رہ جائے اور یہ حوصلہ رکھتا ہو کہ گرد و پیش کی دنیا میں نظر آنے والا معمولی سے معمولی کردار بھی اس کا موضوع بن سکتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ فکشن کی زبان کو ہر طرح کے کلیشے، تصنع آمیزی اور آرائش سے آزاد ہونا چاہئے۔ وہ زبان اس عہد کے سب سے بڑے تین افسانہ نگاروں نے اختیار کی ہے اور وہ ہیں، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی۔

عصمت نے زبان و بیان کا ایسا طور اختیار کیا جس کی تقلید ان کے بعد آنے والی خواتین بھی مشکل سے کر سکیں۔ مجھے ان خواتین میں سب سے زیادہ قابل ذکر واجدہ تبسم نظر آتی ہیں اور دوسری خالدہ حسین جنہوں نے ایک حد تک ایک نئی دنیا اپنے لئے بنائی لیکن عصمت نے جس زبان و بیان کے ساتھ اور بصیرت کی جس آزادی کے ساتھ کہانیاں لکھی ہیں، اس کی پیروی ان کے بعد آنے والی تمام خواتین نہیں کر سکیں۔ چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ آج بھی عصمت کے فن سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ فکشن کی جو روایت سامنے آئی اس کی تعمیر میں ڈاکٹر رشید جہاں کے بعد خواتین میں سب سے موثر رول عصمت کا ہی رہا ہے۔ کتنے بیرئیر ان دونوں نے توڑے۔ ان کی تحریروں میں جس طرح کی کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے اور طرح طرح کے حجابات سے آزاد ہونے اور Taboos کو توڑنے کی جرأت ملتی ہے وہ بجائے خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ عورتیں تو عورتیں، اس طرح کی جرأت مندی عصمت کے ہم عصر مرد افسانہ نگاروں کے یہاں صرف منٹو میں ملتی ہے۔ فکشن کی سب سے بڑی خوبیاں وہی ہوتی ہیں جن پر تاریخ کے تغیرات اثر انداز نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے نہ تو منٹو ہمارے لئے Irrelevant ہوتے ہیں اور نہ عصمت چغتائی۔

عصمت چغتائی کے افسانے جن دنوں مختلف قسم کے تنازعات سے دوچار ہو رہے تھے، ان کے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا کیا رویہ رہا، خاص طور پر اس دوران جو بہت فعال تھے۔

یہ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ منٹو کو چھوڑ کر ان کے تمام ہم عصروں نے ان سے دوری اختیار کر لی تھی۔ منٹو کے ساتھ کیا کم ناانصافی ہوئی، چونکہ وہ بڑا سخت گیر آدمی تھا تو اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن وہ بھی اپنے ہم عصروں سے بہت نالاں رہے۔ ان کو بڑی تکلیف پہنچائی ان لوگوں نے۔ ترقی پسند تحریک کے ایک نمائندہ علمبردار نے انہیں غلاظت نگار تک کہہ دیا۔ جہاں تک عصمت چغتائی کی بات ہے تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی بھیمڑی کانفرنس میں ان کے خلاف باقاعدہ ایک قرارداد پاس کی گئی۔ اس وقت صرف حسرت موہانی ہی ان کی حمایت میں کھڑے ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ منٹو اور عصمت چغتائی کا ساتھ نہ چل سکا۔ دراصل وہ دونوں ترقی پسندی سے بہت آگے تھے۔ ان سے بہت تیز، کہانی کہنے کا ڈھنگ اور انسانی باطن میں چھپے ہوئے رموز تک پہنچنے کا حوصلہ ان دونوں کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔

لیکن عصمت چغتائی کے افسانوں میں جنسیات کے جو عنصر موجود ہیں، وہی تنازعات کا سبب بنے۔

عصمت کے یہاں جنسی اور فحاشی کے انسانی تجربے بہت گہرے اور بہت کم دریافت کئے گئے عناصر ملتے ہیں جو ہمیں بہت سے باکمال افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتے ہیں۔ کوئی تو وجہ ہے کہ ہم نے اردو افسانہ کے ماضی سے دو تین لینڈ مارک جیسے پریم چند، منٹو، عصمت کو ہی موضوع بنا رکھا ہے۔ اردو فکشن کی کوئی بھی بحث ہو، ہم انہیں ضرور یاد کرتے ہیں۔ 'ننھی کی نانی' اور 'دو ہاتھ' جیسے عصمت کے کئی افسانے ہیں، جن میں کسی قسم کی کوئی جنسیت نہیں ہے۔ ان کا انداز بیان بالکل منفرد اور ہمیشہ نئے ذائقے کے ساتھ سامنے آتا تھا۔

ان کے بعد یہ سلسلہ قائم کیوں نہیں رہ سکا جب کہ آزاد خیالی میں زبردست اضافہ ہوا، تمام طرح کی قدامت پسندی زوال پذیر ہوئی۔

واقعہ یہ ہے کہ عصمت چغتائی نے عورت کے جنسی تجربات کو جس خوبصورت پیرائے میں بنا کسی عریانیت کے بیان کرنے کی جو منفرد راہ نکالی تھی اس پر ان کے بعد کوئی نہ چل سکا۔ عصمت غالباً شمالی ہندوستان کی پہلی خاتون ادیبہ تھیں جنہوں نے عورت کی جنسی تہہ داریوں کے رموز کو افشا کرنے کی جرأت دکھائی۔ ان کے بعد تھوڑی بہت جھلک واجدہ تبسم کے یہاں نظر آئی لیکن بہت جلد ان پر پاپولر ادب حاوی ہو گیا۔ نتیجتاً ہمارے زمانے میں جو بازاری پن آیا، شائد وہ اس کی شکار ہو گئیں لیکن عصمت چغتائی اپنے وژن کی محدودیت کے باوجود ان کے یہاں جو سچائی اور انسانی دردمندی کا جو عنصر ملتا ہے اور جس طرح وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ ایک نامعلوم سا تعلق قائم کر لیتی ہیں، وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

عصمت چغتائی بہترین افسانہ نگار کے علاوہ ایک زبردست شخصیت کی بھی مالک تھیں؟ کیا آپ عصمت چغتائی کی شخصیت کے کسی خاص پہلو پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟

عصمت چغتائی کے یہاں ایک بہت بڑے قسم کا ادبی سرمایہ نظر آتا ہے جو انسانیت پر مبنی ہے، غالب کے یہاں کم و بیش اسی طرح کا ادبی سرمایہ ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک ایسے سماج کا تصور تھا جس میں کوئی Taboo نہ ہو۔

ایڈیٹر

❑❑❑

عصمت چغتائی عرف لیڈی چنگیز خاں

پروفیسر علی احمد فاطمی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد
موبائل: 9415306239

عصمت چغتائی کو لیڈی چنگیز خاں کا نام قرۃ العین حیدر نے دیا۔عصمت کی وفات پر عینی نے جو تاثراتی نوعیت کا مضمون لکھا اس کا عنوان یہی تھا۔اس عنوان میں بڑی معنویت اور ہلکی سی پراسراریت ہے۔لیکن ساتھ ہی محبت اور عقیدت بھی۔ ہر چند کہ کافی عرصہ قبل جب قرۃ العین نے لکھنا شروع کیا تھا اور ان کے کئی افسانے شائع ہو کر ایک خاص طبقہ میں شہرت پا رہے تھے ٹھیک انھیں دنوں عصمت نے عینی کو ٹارگیٹ کرتے ہوئے مضمون نما افسانہ لکھا ''پوم پوم ڈارلنگ''، جس میں عصمت نے عینی پر اچھا خاصا طنز کیا اور خوب نصیحت کی۔ پہلے تو یہ لکھا:

''یہ چھوٹے تو اپنے ساتھ بڑے بن جانے کا خمیر لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں۔ یہ نئی پود یہ ہے بے اطمینانی، یہ خوف، یہ زندگی سے فرار اور کچھ بھی نہیں ورثہ میں لے کر جنم لے رہی ہے۔''

اور پھر صاف طور پر یہ بھی لکھا:

''قرۃ العین کے کردار اور ان کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ چار منگ لوگ سب کے سب ایک ہی فرقہ کے ڈھلے ہوئے ہیں۔ سب ہی مرغابیوں کے شکار برگنڈی، کیوٹیکس، رابرٹ ٹائیلر کے سلونے حسن۔کارمن میرانڈا کے گالوں ایشھر ولیم کی سڈول پنڈلیوں کے دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔عیسائی یتیم خانوں کی تعلیم جہاں ذوق شعری ''ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار'' سے شروع ہو کر ''چارج آف دی لائٹ بریگیڈ'' پر ختم ہو جاتا ہے۔''

ایک جگہ اور دیکھئے:

''اختر انساء کا دشمن سماج ہے۔ پولی ڈولی اور شوشو کے دشمن واہمہ شعور۔تحت الشعور۔لاشعور اور قنوطیت ہیں سماج سے تو کوئی بھی لڑ سکتا ہے مگر ان ذہنی بھوتوں سے کون لڑے۔cynic بن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔یہی نہیں وہ اپنے بارے میں بھی برہنہ طور پر لکھتی ہیں:

''میری پھوہڑ ماں اور کثیر الاولاد باپ کو ڈرائنگ روم سجانے کی توفیق نہ ہوئی ورنہ میرا واسطہ بھی ٹونوفو کے سوا کسی انسان سے پڑتا۔''

انھوں نے کمیونسٹوں کو بھی نہیں بخشا۔''سرمایہ داراوں کے ایجنڈہ کو زندگی کے ہر موڑ پر کمیونسٹ دیکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔'' اس مضمون میں اور بھی بہت کچھ ہے۔بظاہر یہ مضمون عینی پر ہے لیکن اس میں غیر شعوری طور پر عصمت کا نقطۂ نظر یا نظریۂ ادب بھی سامنے آتا ہے اور کہانی لکھنے کا مقصد بھی۔

قرۃ العین حیدر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' شائع ہو چکا تھا اور ان کا تخلیقی سفر واقعتا ستاروں سے آگے جانے کو تیار بھی تھا کہ اس موڑ پر عصمت کا یہ تیکھا مضمون کئی زاویوں سے بیحد اہم تھا۔عصمت کے مخصوص اسلوب میں لکھے ہوئے اس مضمون کو عینی نے کس طرح لیا کہہ پانا مشکل ہے لیکن یہ تو ہوا کہ جونیر عینی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور زندگی بھر عصمت پر کوئی مضمون نہیں لکھا۔جبکہ وہ رشید جہاں اور عصمت سے بیحد متاثر تھیں۔ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۹۱ میں جب عصمت کا انتقال ہو گیا تب عینی نے لیڈی چنگیز خاں کے عنوان سے مضمون لکھا اور پچھلی کسی بات کا ذکر نہ کرتے ہوئے کھلے ذہن سے یہ اعتراف کیا:

''وہ ترقی پسند تحریک اور نئے افسانے کی ایک معمار تھیں۔ان کی گہری انسان دوستی کی مثالیں ان کے لاجواب افسانے ننھی کی نانی۔چوتھی کو جوڑا۔بچھو پھوپھی۔اور بھیڑیں ہیں۔''

اور مضمون ختم ہوتا ہے محبت اور جذبہ سے پر ان جملوں پر:

''ان کی جیسی منفرد انسان اور منفرد ادیبہ اب کہاں سے آئے گی، آل چغتائی کی اردوئے معلی کب کی ختم ہوئی۔اردو زبان کی کاٹ

اور پھر صاف طور پر یہ بھی لکھا:
''قرۃ العین کے کردار اور ان کا رویہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ چار منگ لوگ سب کے سب ایک ہی فرقہ کے ڈھلے ہوئے ہیں۔سب ہی مرغابیوں کے شکار برگنڈی، کیوٹیکس، رابرٹ ٹائیلر کے سلونے حسن۔کارمن میرانڈا کے گالوں ایشھر ولیم کی سڈول پنڈلیوں کے دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔عیسائی یتیم خانوں کی تعلیم جہاں ذوق شعری ''ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار'' سے شروع ہو کر ''چارج آف دی لائٹ بریگیڈ'' پر ختم ہو جاتا ہے۔''

اورتر کتازی عصمت خانم کے ساتھ چلی گئی۔''

یہ مضمون تاثراتی اور جذباتی نوعیت کا ہے اور کہیں سے نہیں لگتا کہ یہ پوم پوم ڈارلنگ کے جواب میں لکھا گیا ہے۔تو پھر اس مضمون کا عنوان لیڈی چنگیز خاں کیوں ہے کیا یہ پوم پوم کا جواب ہے۔یقیناً نہیں۔ چنگیز اشارہ ہے ان کے آباد واجداد کی طرف جن کے سرے چنگیز خاں سے ملتے ہیں۔چنگیز اشارہ ہے عصمت کی مزاجی کیفیت کی طرف جو ان کی بے باکی۔بے حجابی اور برہنہ حقیقت نگاری سے منسوب ہے۔اسی لیے ان کے بعض ہم عصروں نے بھی طرح طرح کے نام دیے۔کسی نے ان کے افسانوں میں سفاک جذباتیت تلاش کی کسی نے تیزابیت اور کسی نے بغاوت۔یہ بغاوت کس سے اور یہ سرکشی کیوں؟ یہ جاننے کے لیے مختصراً ان کی زندگی اور خاندان کے وار دات اور معاملات کو سمجھنا پڑے گا۔

عصمت چغتائی ۲۱ راگست ۱۹۱۵ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی پڑھے لکھے روشن خیال انسان تھے لیکن کثیر اولاد تھے۔دس بچے ہوئے ۔عصمت نویں نمبر پر تھیں۔ بہنیں بڑی تھیں اس لیے بھائیوں کا ساتھ زیادہ ہوا۔ لڑکوں جیسی حرکتیں ۔گڑیا گڈا کے بجائے ہاکی کرکٹ ۔یہاں تک کہ گلی ڈنڈا وغیر کھیلتیں ۔والدین کی عدم توجہ اور بھائیوں کی شرارت بلکہ ہتک آمیز صحبتوں نے انھیں بچپن سے ضدی اور بیباک بنا دیا (ملاحظہ ہو ان کی پہلی کہانی بچپن) والد سرکاری ملازم تھے ادھر ادھر تبادلہ ہوتا تھا بالآخر پینشن لے کر آگرہ میں قیام کیا۔آگرہ کے گلی کوچے ۔گھٹا گھٹا ماحول اور حساس و بیباک عصمت۔آپ بیتی میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''آگرہ کی ان مردہ گلیوں میں پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے کا صدمہ ہوا۔عورت خدا نے کیوں پیدا کی۔مری پٹی۔مجبور و محکوم ہستی کی کیا ضرورت۔دھوبن روز رات کو پٹتی تھی۔مہترانی کے آئے دن جوتے پڑا کرتے تھے۔پاس پڑوس کی تمام ہی عورتیں آئے دن اپنے شوہروں کے جوتے کھایا کرتیں تھیں اور میں خدا سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔اے اللہ پاک مجھے لڑکا بنادے۔۔۔۔جب تک دوسرے شہروں میں رہے آزاد رہے اپنے کنبہ میں آکر تو جیسے بیڑیاں پڑگئیں۔

مجھے آگرہ کی شرمیلی دبی دبائی لڑکیوں سے مجبوراً بہناپا جوڑنا پڑا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ ظاہر میں بھولی نظر آنے والی لڑکیاں بڑی چلتی پرزہ ہیں۔چھپ کر گل کھلائے جاتے ہیں کہ الٰہی توبہ۔بڑھیوں کو چٹکیوں میں الو بنا کر گلی کے لونڈوں سے خوب خوب پینگیں بڑھی ہیں۔مجھے اس دوغلی زندگی سے بڑی کراہیت آئی۔''

(آپ بیتی)

ان کراہیتوں کو ذہن کے نہاں خانوں میں جذب کر کے وہ بغرض تعلیم علی گڑھ آگئیں۔بڑے بھائی عظیم بیگ ساتھ میں تھے۔انھوں نے اسکول کے علاوہ گھر پر انگریزی ۔اردو پڑھائی۔ترجمے کروائے۔عظیم بیگ کے قریب ہوئیں اور نہ صرف ان کی عادت بلکہ ہلکی سی بغاوت کو بھی محسوس کیا بقول عصمت۔''میری طبیعت جو پہلے سے خودسر تھی اور ضدی تھی ان کی شہہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔'' علی گڑھ سے ایف۔اے۔پاس کیا اسکے آگے تعلیم نسواں کا انتظام نہ تھا اس لیے ضد کر کے وہ لکھنو گئیں اور ازابلا تھوبرن (آئی۔ٹی۔) کالج میں داخلہ لیا اور اس کالج سے ۱۹۳۶ء میں بی۔اے۔پاس کیا اسی درمیان لکھنو میں ان کی ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں انگارے والی سے ہوئی جو انگارے کے حادثہ سے بیحد مشہور ہو چکی تھیں۔انھیں کے اصرار پر ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس میں شرکت کی اور اس وقت کے بڑے ادیبوں خاص طور پر پریم چند کو بہت قریب سے دیکھا۔لکھنو کا قیام علی گڑھ سے زیادہ پر اثر رہا۔خود عصمت نے ایک جگہ لکھا ہے:

''لکھنو میں گزارے ہوئے دو سال میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئے دل و دماغ کو نئی راہیں ملیں۔نئے دروازے کھلے۔'' (آپ بیتی)

واپس علی گڑھ آکر ٹریننگ کا کورس مکمل کیا۔وہ اپنے خاندان ،بزرگوں کی مرضی کے خلاف جا کر تعلیم حاصل کرتی رہیں۔صرف ملازمت کے لیے نہیں۔خود کفیل ہونا ان کی فکر کا حصہ تو تھا ہی ساتھ ہی وہ عورتوں کی جہالت ،توہمات و دیگر کمزوریوں کے خلاف لڑنا چاہتی تھیں۔عصمت نے کئی جگہ ملازمت کی۔ریاست جاروہ،بریلی ،جودھ پور اور سب سے بعد میں بمبئی۔۱۹۴۲ء میں انھوں نے شاہد لطیف سے شادی کر لی جن سے ان کی ملاقات علی گڑھ میں ہوئی تھی۔یہیں سے دوستی کا آغاز ہوا جو بعد میں شادی کے انجام تک پہنچا۔گھر والے مخالف تھے لیکن عصمت نے ایسی مخالفتوں کی کبھی پروانہ کی اور اپنی شرطوں پر زندگی گزارتی رہیں یہ شرطیں شوہر کے ساتھ بھی تھیں۔

ٹھیک انہیں دنوں لحاف والا قصہ یا مقدمہ بھی ہوا۔لیکن اس سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی پہلی کہانی کب اور کہاں شائع ہوئی۔پڑھنے لکھنے کی عادت تو بچپن سے تھی۔گھر میں علمی و ادبی ماحول تھا۔بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی ادیب تھے۔ رسائل و اخبارات آتے تھے جنھیں کم عمر عصمت خوب پڑھتیں۔عصمت اپنے بڑے بھائی سے بیحد متاثر تھیں۔چنانچہ عظیم بیگ ۔نیاز،جوش،یلدرم۔مجنوں وغیرہ اور سب سے زیادہ حجاب اسماعیل کے افسانوں کو پڑھ کر عصمت کے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی یوں تو وہ کم عمری سے ہی لکھتی تھیں اور پھاڑ دیتی تھیں۔لیکن پہلی کہانی بچپن کے عنوان سے لکھی جو مئی ۳۸ میں ساقی میں شائع ہوئی۔کچھ لوگ گیندا کو پہلی کہانی مانتے ہیں۔ خود عصمت نے کئی انٹرویو میں کہا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اشاعت کے حوالے سے گیندا ان کی تیسری کہانی

ہے۔دوسری کہانی نیرا ہے۔

زندگی کے اسی موڑ پر دو تین واقعات ایسے رونما ہوئے جس نے عصمت کے فکر و خیال اور جمال و جلال میں انقلاب برپا کر دیا۔ انگارے کا ہنگامہ تو ہو ہی چکا تھا لیکن اثرات ہنوز باقی تھے۔ ۳۶ء میں ترقی پسند ادیبوں سے ملاقات اور کانفرنس میں شرکت اور سب سے بڑھ کر ڈاکٹر رشید جہاں سے ملاقات اور قربت ۔ایک جگہ وہ اعتراف کرتی ہیں:

''اور زندگی کے اس دور میں مجھے ایک طوفانی ہستی سے ملنے کا موقع ملا۔جس کے وجود نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔روشن آنکھوں اور مسکراتے شگفتہ چہرے والی رشیدہ آپا سے کون ایسا تھا کہ ایک دفعہ مل کر بھنّا نہ جائے۔اور میں نے بے سمجھے بوجھے ان کے ہر لفظ کو موتی سمجھ کر پہن لیا تھا۔1938 میں رشیدہ آپا انگاروں والی رشیدہ آپا بن چکی تھیں۔اب ان کی سلگتی ہوئی باتیں پلے بھی پڑنے لگی تھیں۔''

''پھر میں نے چوری چھپے انگارے پڑھی۔رشیدہ آپا ہی مجھے ایک ہستی نظر آئیں جنھوں نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کی۔میں نے انہیں اپنا گرو مان لیا۔علی گڑھ کی چھوٹی زہر آلود فضا میں وہ بڑی بدنام تھیں۔میری صاف گوئی کو انھوں نے سراہا اور پھر میں نے ان کی بتائی ہوئی کتابیں چاٹ ڈالیں۔'' (آپ بیتی)

زندگی کے اسی موڑ پر انھوں نے انگریزی ادب کا فکشن اور ڈراما کا گہرا مطالعہ کیا اور رشید جہاں کی ہدایت پر مارکسزم اور سوشلزم کو بھی پڑھا۔وہ برناڈ شا سے بہت متاثر ہوئیں اور ایک خیال ہے کہ انکا پہلا ڈراما فسادی شا سے ہی متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔انگریزی ادب اس کے بعد روسی ادب۔انگارے کی کہانیوں کا مطالعہ۔اعلیٰ تعلیم اور گھر اور سماج کے فرسودہ ماحول نے عصمت کو روشن خیال اور بیباک بنا دیا اور وہ ضدی پن اور خودسری جو بے لگام تھی اسے اب ایک راہ ملنے لگی تھی۔راستہ اور نظریہ مل چکا تھا۔ایک انٹرویو میں وہ کہتی ہیں:

''انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع سے ہی تھا مگر ان میں روسی رائٹر اور فرانسیسی اور عام انگریزی رائٹرس کو بھی پڑھا۔جس نے مجھے ایک وسیع النظر بنایا اور لکھنے کا شوق بھی انہیں ادیبوں کی مرہون منت ہے۔لکھنو کی فضا اور لائبریری کی روزانہ کی اسڈی نے میرے کو اور ہی زیادہ بلند خیال بنا دیا۔اور سوچنے کی قوت بھی مجھے اسی ماحول سے ملی۔''

(عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات از ڈاکٹر محمد اشرف ص ۱۸۸)

ان کرامتیوں کو ذہن کے نہاں خانوں میں جذب کر کے وہ بغرض تعلیم علی گڑھ آ گئیں۔بڑے بھائی عظیم بیگ ساتھ میں تھے۔انھوں نے اسکول کے علاوہ گھر پر انگریزی۔اردو پڑھائی۔ترجمے کروائے۔عظیم بیگ کے قریب ہوئیں اور نہ صرف ان کی عادت بلکہ ہلکی سی بغاوت کو بھی محسوس کیا بقول عصمت۔''میری طبیعت جو پہلے سے خود سر تھی اور ضدی تھی ان کی شہہ پا کر اور بھی قابو سے باہر ہو گئی۔''علی گڑھ سے ایف۔اے۔پاس کیا اسکے آگے تعلیم نسواں کا انتظام نہ تھا اس لیے ضد کر کے وہ لکھنو گئیں اور ازابلا تھوبرن (آئی۔ٹی۔) کالج میں داخلہ لیا۔

ایک واقعہ اور سنئے۔ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس میں انھوں نے پہلی بار پریم چند کو دیکھا۔ان کے بارے میں وہ کیا کہتی ہیں انھیں کی زبانی سنیئے:

''وہ میرے محبوب رائٹر تھے اور صاحب میں نے ان کو انگلی سے چھوا۔ایک انگلی سے چھونے سے میں رائٹر ہو گئی اگر پورا ہاتھ رکھ دیتی تو نہ جانے کیا بن جاتی نہ جانے کیا ہو جاتی۔میرے قلم میں جو طاقت آئی ہے وہ پریم چند کے چھونے سے آئی وہ میرے سب سے زیادہ محبوب ادیب تھے۔''

(پریم چند غیر افسانوی نگارشات از محمد اشرف ص ۱۹۲)

ان جملوں میں عقیدت زیادہ ہے تاہم کچھ حقیقت بھی ہے وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا اس وقت بقول سجاد ظہیر اردو ہندی میں پریم چند سے بڑا ادیب کون تھا۔ان کا طوطی بول رہا ہے۔عصمت کا قلم بولنے لگا اور پھر وہ دھڑا دھڑ ہنگامہ خیز افسانے لکھنے لگیں۔ان کی پہلی کہانی بچپن ضرور ہے لیکن اصل شہرت ملی گیندا سے جو ترقی پسندوں کے رسالہ نیا ادب میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جس نے ترقی پسند ادیبوں کو متوجہ کیا۔خیال رہے کہ انھیں دنوں (اپریل ۱۹۳۹) نیا ادب لکھنؤ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا جس کے مرتبین علی سردار جعفری ،سبط حسن اور مجاز تھے۔گیندا کی اشاعت نے انھیں ترقی پسند حلقہ میں لا کھڑا کر دیا ورنہ اس سے قبل ان کی تحریریں ساقی میں شائع ہوئی تھیں۔ساقی کے سالنامہ (۱۹۴۰) میں عصمت کی دو کہانیاں تکملہ اور ڈائن شائع ہوئیں جس میں ڈائن کو خصوصی توجہ اور شہرت ملی۔درمیان میں دو ایک کہانیاں اور شائع ہوئیں لیکن بے باک عصمت کو حقیقی پہچان اس وقت ملی جو مرتے دم تک قائم رہی اور جس سے وہ کبھی الگ نہ ہو سکیں۔اور جس کا انھیں زندگی بھر قلق بھی رہا۔وہ تھا ۱۹۴۲ء کا سال اس سال ان کی دو ایسی تخلیقات شائع ہوئیں جس نے عصمت کی پیشانی پر ایک ایسا لیبل لگا دیا جو زندگی بھر چپکا رہا۔پہلی تخلیق تھی لحاف اور دوسری دوزخی ۔پہلے لحاف کے بارے میں عصمت کے خیالات سنئے:

''مگر جب میں نے لحاف لکھا تو پھر بم پھٹ پڑا۔ادبی اکھاڑے میں میرے پرزے اڑ گئے۔کچھ لوگوں نے میری حمایت میں بھی قلم اٹھایا۔اس سب سے مجھے فحش نگاری کا لقب دے دیا گیا۔لحاف سے پہلے اور لحاف کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اس پر کسی نے غور نہیں کیا۔لحاف کا لیبل اب بھی میری ہستی سے چپکا ہوا ہے۔لحاف میری

چڑ بن گیا۔ میں کچھ بھی لکھوں لحاف کی تہوں میں دب جاتا۔ لحاف نے مجھے بڑے جوتے کھلوائے۔'' (آپ بیتی)

لحاف کو جنسی کہانی کہا گیا اور اس پر فحاشی کا الزام لگایا گیا۔ کچھ دیوانوں نے تو لاہور کی عدالت میں مقدمہ بھی دائر کر دیا۔ اسی طرح جیسے منٹو کی کہانیوں پر مقدمے چلے۔ عصمت کے پاس سمن آیا۔ سمن کی سرخی پر لکھا تھا "The Crowv vs Ismat Chughtai" اس وقت عصمت اپنے شوہر کے ساتھ ممبئی میں تھیں گود میں چھوٹی سی بیٹی تھی۔ اور ساتھ میں رشید جہاں کے چھوٹے بھائی محسن عبداللہ بھی تھے۔ عصمت نے سمن لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن شاہد و محسن زمانہ شناس تھے گھبرا گئے۔ ضمانت تو ہو گئی لیکن لاہور کی عدالت کا منھ دیکھنا پڑا۔ منٹو بھی ساتھ میں تھے اور خوش تھے، بار بار کہتے تھے:

''ارے ایک ہی تو معرکے کی چیز لکھی ہے آپ نے۔ اماں شاہد تم بھی کیا آدمی ہو یار تم بھی چلنا۔ تم نے جاڑوں کا لاہور نہیں دیکھا ہے۔ خدا کی قسم ہم تمہیں اپنا لاہور دکھائیں گے۔ کیا تیکھی سردی پڑتی ہے۔ تلی ہوئی مچھلی آہا ہا۔ وہسکی کے ساتھ، آتش دان میں دہکتی ہوئی آگ جیسے عاشقوں کے دل جل رہے ہوں اور بلڈ ریڈ مالٹے آہا جیسے معشوق کے بوسے۔''

(لحاف پر چلے مقدمے کی کہانی عصمت کی زبانی)

لوگ کہتے رہے کہ معافی مانگ لو لیکن عصمت جیسی بہادر بے باک خاتون کا معافی سے کیا رشتہ۔ مقدمہ چلتا رہا اور وہ لاہور گھومتی رہیں۔ بزرگ ادیبوں (ایم۔ اسلیم) سے بحثیں کرتی رہیں۔ ایم۔ اسلم سے کہتی رہیں کہ آپ نے جو گناہ کی راتیں لکھی چٹخارے کی زبان لکھی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے لحاف لکھ دی تو اتنا ہنگامہ۔ وہ کہتے رہے کہ ''میں مرد ہوں میری بات اور ہے۔'' عصمت کہتی رہیں کہ میں عورت ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ کو سب کچھ لکھنے کا حق ہے اور مجھے نہیں۔ کیوں؟ اس کیوں کا جواب نہ ایم اسلیم کے پاس تھا اور نہ آج تک کسی مرد ادیب کے پاس ہے۔

بہر حال دو ایک پیشی کے بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔ اس لئے کہ مخالف وکیل بحث میں فحش ثابت نہ کر سکا اور عصمت نے برطانیہ حکومت کا شکریہ ادا کیا کہ مقدمہ کے بہانے لاہور میں عیش کرنے کو ملا۔ کاش کہ دو چار مقدمے اور چل جاتے۔ یہ تھیں عصمت چغتائی۔

اسی طرح دوزخی لکھا۔ اپنے چہیتے بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ۔ خاندان والے خفا ہو گئے کہ بڑے بھائی کو دوزخی لکھ دیا۔ کیسی بہن ہے لعنت ہے ایسی بہن پر۔ لیکن عصمت کہتی رہیں کہ اس خاکہ کو لکھتے وقت وہ کس دوزخ سے گزری ہیں۔ لیکن خاندان کا غصہ اپنے شباب پر تھا لیکن عصمت کو کیا پروا۔ وہ جو لکھنا چاہتی ہیں لکھ جاتی ہیں بعد میں لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ ان تحریروں کی معنویت اور اہمیت کیا ہے۔ بعد میں یہی دو تحریریں عصمت کی بہترین تخلیقات میں شامل ہوئیں، پھر تو عصمت نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور یکے بعد دیگرے ایک سے ایک عمدہ افسانے، ڈرامے اور ناول لکھتی رہیں۔ ۱۹۴۴ میں لکھے گئے ناول ٹیڑھی لکیر نے عصمت کو شہرت و عظمت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ افسانوں میں ان کے یادگار افسانے ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی، چوتھی کا جوڑا، ہندوستان چھوڑ دو، جڑیں، چٹان، ڈائن، امر بیل، نیند وغیرہ صرف عصمت کی ہی نہیں بلکہ اردو کی عمدہ کہانیوں میں شامل ہیں۔ اسی طرح ناول کا سلسلہ ضدی (۱۹۴۱) سے شروع ہو کر ایک قطرۂ خون (۱۹۷۵) تک پھیلا ہوا ہے۔ درمیان میں معصومہ، دل کی دنیا، عجیب آدمی، باندی وغیرہ ہیں۔ کاغذی ہے پیرہن کے نام سے آپ بیتی بھی لکھی۔ اپنے غیر معمولی افسانوں، ناولوں، شہرت و عظمت کے ذریعہ وہ پریم چند کے بعد منٹو، بیدی کرشن چندر کی صف میں کھڑی ہو گئیں۔ نئے افسانے کے معماروں میں جن چار ستون کا شمار ہوتا ہے ان میں ایک اہم نام عصمت کا بھی ہے۔ وارث علوی نے غلط نہیں کہا:

''منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت چاروں نے مالا مال کر دیا اردو افسانے کو۔ ان کے عہد میں جینے کا مطلب تھا ہر آن خوبصورت افسانوں کو چمکتے ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلنا۔ عصمت کا بھی کیا زمانہ تھا کیا رعب داب تھا کیا طنطنہ تھا۔''

(عصمت کے فن کے چند پہلو)

دیکھنا یہ ہے کہ یہ رعب و طنطنہ کیا ہے۔ جو اکثر شور و غل میں بدل جاتا ہے۔ خواتین افسانہ نگار تو عصمت سے قبل بھی تھیں۔ لیکن عصمت نے ایسا کیا کر ڈالا کہ ایک طرف ہنگامہ بھی ہوا تو دوسری طرف وہ عظمتوں کے اس مینارے پر بھی جا بیٹھیں جہاں منٹو، کرشن، بیدی براجمان ہیں۔ اس کا تعلق افسانے کے فکر و فن سے ہے اور یہ مضمون تعارفی اور تاثراتی زیادہ ہے پھر بھی یہ ضرور عرض کروں گا کہ عصمت کے تخلیقی عمل کا مرکز گھر ہے اور گھر سے متعلق تمام مانوس چہرے جو ماں باپ سے ہوتے ہوئے بھائی بہن، چچا بابا، ماموں ممانی، بھابی سے ہوتا ہوا ملازماؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ مانوس چہرے جس قدر قریب ہوتے ہیں ان کے باطن سے ہم اتنے ہی دور۔ لیکن عصمت کے قلم نے ان چہروں سے نقاب اٹھایا اور قارئین کو شاکڈ (Shocked) والی کیفیت سے دوچار کیا۔ ان کی شناخت کے پرخچے اڑائے۔ یہ کام بظاہر انھوں نے قلم سے کیا لیکن وارث علوی کی زبان میں اپنے ناخنوں سے ان نقوش کو ابھارتی بھی رہیں اور مٹاتی بھی رہیں۔ اسی لئے کسی نے ان کو گھر کا بھیدی کہا کسی نے ناگفتنی کو گفتنی کہا۔ پردے کے پیچھے کی باتیں پردے کے باہر لائیں۔ خود آگ لگاتی رہیں اور خود ہی مسلسل اس کو ہوا دیتی رہیں۔ یہ کام صرف عصمت چغتائی ہی کر سکتی تھیں۔ ان کا ذہن، ان کا قلم اور افسانے کا فن۔ مجنوں گورکھپوری جیسے سینیر نقاد

نے کہا: ''ایسی جرأت تو ایک طنّاز عورت ہی کر سکتی ہے۔ جو باغی ہوگئی ہو اور عصمت ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں ان کو باغی تو تسلیم کرنا پڑے گا۔'' (عصمت اور ان کے افسانے) کرشن چندر کا خیال ہے کہ ''عصمت پرانی قبروں کی پرستش نہیں کرتیں جیتے جاگتے انسانوں کی کہانیاں سناتی ہیں وہ رومان کے تخیلی ہیولے تیار نہیں کرتیں بلکہ حقیقت کو اپنے تخیل کی شفاف آگ میں پگھلا کر اپنی زبان کے تیز و تند اور تلخ تیزاب میں اتار کر جاندار مرقعے تیار کرتی ہیں۔'' یہ الگ بات ہے کہ ان مرقعوں میں عورتوں کے مرقعے زیادہ ہیں۔ جن کو انھوں نے توڑا بھی ہے اور سجایا سنوارا بھی ہے۔ اور ایک نئی باغی عورت کو تیار بھی کیا ہے۔ عصمت کے یہاں بظاہر مظلوم عورتیں ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ وہ صدیوں کی روایت سے سجی عورتوں کی متھ کو توڑ رہی تھیں۔ صدیوں کے فرسودہ تصورات پر ضربیں لگا رہی تھیں۔ وارث علوی نے ٹھیک کہا ہے:

''عورت کی شکست و ریخت۔ عورت کے متعلق تمام رومانی اور رفیع الشان تصورات کا انہدام۔ ڈی متھ لو جائی زشین۔ ڈی رومانئی زیشین اور ڈی گلوری فی کیشن کا یہ کام عصمت نے اتنے بڑے پیمانے پر کیا ہے کہ اس کام سے مماثلت رکھنے والی ادیبہ خود مغرب میں نظر نہیں آتی۔''

(عصمت کے فن کے چند پہلو)

عجیب بات ہے کہ جہاں گیندا، ڈائن، چوتھی کا جوڑا وغیرہ میں جوان اور کمزور عورتیں ہیں وہیں ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی جیسی بزرگ عورتیں بھی ہیں۔ وہ عصمت جو بڑی بوڑھیوں سے خار کھاتی تھیں یہاں تک کہ اپنی والدہ کو ناپسند کرتی تھیں وہی عصمت والدہ کے قابل رحم بڑھاپے کے توسط سے نانی اور پھوپھی تک پہنچتی ہیں۔ اور انھیں زندہ کرتی ہیں۔ جیسے پریم چند نے بوڑھی کاکی کو زندہ کر دیا۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اگر بوڑھی کاکی نہ ہوتی تو شاید ننھی کی نانی اور بچھو پھوپھی بھی نہ ہوتیں۔ اس لئے کہ عصمت بہر حال پریم چند اور انگارے سے متاثر تھیں اور انھیں کے درمیان سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کرتی ہیں اور پھر ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت تک پہنچتی ہیں۔ اس رشتے کے تعلق سے انھوں نے باقاعدہ ایک مضمون ''ترقی پسند ادب اور میں'' بھی لکھا۔ اس مضمون میں اگر ایک طرف وہ یہ کہتی ہیں:

''سن پینتیس میں میں نے ترقی پسند مصنفین کی پہلی میٹنگ میں شرکت کی تھی۔ منشی پریم چند اور انگارے کے مصنفین کو دور سے دیکھا تھا میں اس وقت لکھنؤ میں بی۔ اے۔ کی طالبہ علم تھی اور ہم چند لڑکیوں کو رشید جہاں اس میٹنگ میں لے گئی تھیں۔''

اس کے بعد یہ بھی لکھا:

''ان کی (ترقی پسندوں کی) صحبت میں میں نے بہت سے اجالے دیکھے۔ مجھے گھر کی چہار دیواری سے باہر جھانکنے کا موقع ملا۔ میں نے کسی خاص مقصد سے لکھنا شروع نہیں کیا تھا لیکن جو مقصد ترقی پسند تحریک سے واضح ہوا اسے میری ذہنیت نے بڑے شوق سے قبول کیا۔ کمیونسٹ پارٹی سے قربت بڑھی تو مجھے طبقاتی اتار چڑھاؤ کا علم ہوا۔ اور میں نے پہلی بار جانا کہ میری مسرتوں کی دشمن میری دادی نانی نہیں، یہ نظام حکومت ہے۔''

''ترقی پسند تحریک سے میں نے وہ سب کچھ چن لیا جو میرے دل کو لگا۔''

''اپنی آزاد طبیعت کے باوجود اشتراکیت سے بیحد متاثر ہوئی۔ اور ہمیشہ رہوں گی۔''

''جب تک بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی رہے گی ترقی پسندی زندہ رہے گی۔''

ظاہر ہے یہ سارے خیالات ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد پیدا ہوئے اور ان کی بے باک بے خوف طبیعت میں گھل مل گئے۔ اور ان کی بے باکی، افسانہ نگاری کو ایک راستہ مل گیا۔ نظریہ بھی۔ سید محمد عقیل نے درست لکھا ہے:

''عصمت کے تیکھے پن اور بیباکی کو جوان کی فطرت میں پہلے سے موجود تھی اس سے (تحریک سے) اور ہوا ملی۔''

(عصمت اور ان کے افسانے)

لیکن پھر بھی ہمارے نقادوں نے ان کے فکر و نظر پر کم ان کی بے باکی، بے حجابی وغیرہ کے حوالے سے زیادہ لکھا اور سمجھا یا پھر ان کے اسلوب پر باتیں کیں۔ عورت کے بارے میں مردوں نے خوب خوب لکھا لیکن ایک عورت (عصمت) عورت کے بارے میں کیا کہتی ہے ملاحظہ کیجئے:

''ہر دور میں عورت ایک مسئلہ ہے۔ ساری دنیا کا یہ مسئلہ ہے کیونکہ ہر دور میں مردانہ سماج نے عورت پر ظلم و ستم کئے ہیں۔ مرد عورت کو ذلیل کرتا ہے اور خود اس کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں عورت دینا کی اہم ترین چیز ہے۔ دنیا کا اہم حصہ ہے۔ عورت سے دنیا کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے عورت کی اہمیت دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اس اہمیت سے جو شخص انکار کرتا ہے وہ عورت کا دشمن ہے۔''

ٹھیک انہیں دنوں لحاف والا قصہ یا مقدمہ بھی ہوا۔ لیکن اس سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی پہلی کہانی کب اور کہاں شائع ہوئی۔ پڑھنے لکھنے کی عادت تو بچپن سے تھی۔ گھر میں علمی و ادبی ماحول تھا۔ بڑے بھائی عظیم بیگ چغتائی ادیب تھے۔ رسائل و اخبارات آتے تھے جنہیں کم عمر عصمت خوب پڑھتیں۔ عصمت اپنے بڑے بھائی سے بیحد متاثر تھیں۔ چنانچہ عظیم بیگ۔ نیاز، جوش، یلدرم۔ مجنوں وغیرہ اور سب سے زیادہ حجاب اسماعیل کے افسانوں کو پڑھ کر عصمت کے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی یوں تو وہ کم عمری سے ہی لکھتی تھیں اور پھاڑ دیتی تھیں۔

(عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات از محمد اشرف ص ۲۰۵)

ایک جگہ یہ بھی لکھتی ہیں ''مرد بلا وجہ بدنام ہے، عورت خود مکار ہے'' عصمت نے عورتوں کو بھی نہیں بخشا۔ عیاش مردوں کو نہیں بخشا۔ خواہ ان کے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ (ملاحظہ کیجئے کہانی گیندا)۔ نانی، پھوپھی، بھابی، سب ان کی اپنی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کہانی لحاف میں بھی ان کی ایک عزیزہ ہیں۔ عصمت ایک انصاف پسند حق گو اور جذباتی قسم کی خاتون تھیں لیکن ان کی جذباتیت میں لجلجا پن نہیں تھا بلکہ برہنہ حقیقت اور سفاک جذباتیت تھی، جو انھوں نے گھر محلے میں دیکھا اسے پوری سچائی، بے باکی اور فنکاری کے ساتھ لکھ دیا۔ اب صداقت اور حقیقت کی اپنی ایک جمالیات تو ہوتی ہی ہے۔ اور ایک اسلوب بھی۔ لیکن اسلوب کے بارے میں کسی نے سچ کہا ہے کہ وہ از خود پیدا ہوتا ہے۔ فن کار کی نیت اور نظریہ سے۔ وہ اپنے آپ میں کوئی الگ سی چیز نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہ کوئی بھی فنکار محض اپنے اسلوب سے منفرد تو ہوسکتا ہے لیکن عظیم نہیں۔ البتہ ماحول، کردار، ادراک کی تہذیب و ثقافت بھی اسلوب کے ساتھ ساتھ کام کرتی ہے۔ بلکہ گھل مل کر اسلوب میں رنگ و روغن کرتی چلتی ہے۔ لیکن جس کے لئے غیر معمولی مشاہدے کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو عصمت کے پاس تھا۔ اور ایک نظریہ بھی۔ تبھی پوم پوم ڈارلنگ میں یہ جملہ بھی آتا ہے۔ ''ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ لکھنے والے پڑھنے والے کے لئے ہی لکھتے ہیں کچھ چٹخارے کے لئے نہیں۔'' اسی مضمون میں ایک جگہ اور لکھتی ہیں:

''عوام کی مدد کرنے کا یہی طریقہ نہیں کہ ہم اوٹ پٹانگ بغیر جانے بوجھے ان کے بارے میں لکھنا شروع کردیں، وہ جو واقعی عوام میں جذب ہوکر ان کے بن سکتے ہیں تو کیا کہنے لیکن وہ جن کی وسعتیں محدود ہیں اور وہ درمیانہ طبقے سے زیادہ قریب ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے طبقے کی صرف عکاسی ہی نہ کریں بلکہ اپنے فن کی رو سے ان کے خاکوں میں جاذب نظر رنگ آمیزی سے صحت بخش نظریہ پیش کریں۔''

(پوم پوم ڈارلنگ)

عجیب بات ہے کہ اس قدر صداقت پسندی اور ترقی پسندی کے باوجود ترقی پسند نقادوں نے ان کے بارے میں کم سے کم لکھا۔ احتشام حسین، ممتاز حسین سے لے کر قمر رئیس تک کسی نے ان کے فکر و فن پر قلم نہیں اٹھایا۔ وارث علوی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں:

''عصمت کے سامنے سب نقاد بونے بنے لحاف اور ذکر کر کے کھی کھی کرتے نظر آتے ہیں۔

''عصمت کے سامنے سب نقاد بونے بنے لحاف اور ذکر کر کے کھی کھی کرتے نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر نے غلط نہیں کہا کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں پر دورے پڑنے لگتے ہیں۔

عصمت اس بات کا عبرت ناک ثبوت ہے کہ ترقی پسند فنکاروں کو ترقی پسند نقادوں کی طرف سے کوئی انصاف نہیں ملا۔ وجہ یہ ہے کہ فن ہمیشہ نظریہ سے بڑا ہوتا ہے اور مارکسی تنقید کی کسوٹی پر مارکسی فنکار بھی پورا نہیں اترتا اور جدید نقاد تو حقیقت پسند آرٹ کی ڈٹمنے مکس سمجھنے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔''

کرشن چندر نے غلط نہیں کہا کہ عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں پر دورے پڑنے لگتے ہیں۔ عصمت اس بات کا عبرت ناک ثبوت ہے کہ ترقی پسند فنکاروں کو ترقی پسند نقادوں کی طرف سے کوئی انصاف نہیں ملا۔ وجہ یہ ہے کہ فن ہمیشہ نظریہ سے بڑا ہوتا ہے اور مارکسی تنقید کی کسوٹی پر مارکسی فنکار بھی پورا نہیں اترتا اور جدید نقاد تو حقیقت پسند آرٹ کی ڈٹمنے مکس سمجھنے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔''

(عصمت کے فن کے چند پہلو)

پھر بھی عصمت کے عظیم ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ ترقی پسندوں کو بھی نہیں اور جدیدیوں کو بھی نہیں۔

آج جب ہم عصمت چغتائی کے صدی سال سے گزر رہے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ پوم پوم اور چنگیزیت وغیرہ کے ابہامی والزامی دائروں سے نکل کر نئے دور کی حقیقت، تانیثیت، صارفیت کے استحصالی نٹ ورک میں پھنسے اس عام انسان کو تلاش کریں جو آج کے افسانوی ادب میں اس طرح نظر نہیں آرہا ہے جس طرح عصمت، منٹو، کرشن وغیرہ کے یہاں نظر آتا تھا۔ افسانہ نویسی بنیادی طور پر فن ہے لیکن نظریہ بھی انسان دوستی کا، دردمندی کا، تبھی ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی، کے ساتھ ساتھ کالو بھنگی، منگو کوچوان، لاجونتی، رانو، شمن جیسے کردار زندہ جاوید ہو گئے۔ عصمت میں ہزار بے باکی، بہادری، چنگیزیت و سفاکیت رہی ہو لیکن پھر بھی وہ ایک پختہ فنکار تھیں اور ایک بالیدہ عورت۔ دردمند اور جذباتی عورت تبھی تو لحاف کی اشاعت پر منٹو عصمت سے ملنے گیا اور واپس آکر اپنی بیوی سے کہا ''ارے وہ تو پوری عورت نکلی'' منٹو کے ہی ان جملوں پر میں اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں:

''عصمت اگر بالکل عورت نہ ہوتیں تو اس کے مجموعوں میں بھول بھلیاں، تل، لحاف اور گیندا جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہ آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک، یہ ادائیں وہ عشوے، وہ غمزے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کئے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزلِ مقصود انسان کا ضمیر ہے۔ جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی انجانی، ان بوجھی مگر مخملیں فطرت سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔''

(عصمت چغتائی)

□□□

عصمت چغتائی کا فن

ڈاکٹر صبیحہ انور
نامی پریس بلڈنگ، نخاس، لکھنؤ
موبائل: 9839132270

عصمت چغتائی کی شخصیت اور فن کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے تو وہ لفظ ہوگا 'انحراف'۔ ہر اکتاہٹ بھری فرسودہ فکر سے انحراف۔

بہت سی سیدھی لکیروں کو بیچ سے کاٹتی ہوئی ایک ٹیڑھی لکیر جو اپنی اہمیت اور اپنے وجود کا خود یقین دلاتی ہے۔ اسی لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوا کہ لکیر بذات خود ٹیڑھی تھی یا دیگر لکیروں کے مقابلے پر ٹیڑھی نظر آتی تھی۔ اس انحراف کو بغاوت کا نام بھی دیا گیا۔ کیونکہ عصمت چغتائی نے اپنی کہانیوں کے لئے جن موضوعات اور اسلوب کا انتخاب کیا وہ عام روش سے مختلف تھے۔ لہجے کی سرکشی اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے باغی اور بغاوت کا نام دینا بہت آسان تھا۔ عوامی زندگی کی تصویر کشی اور ہندوستانی عوام کے روز مرہ کے مسائل تو ہمارے افسانے کا موضوع تھے۔ کلرک، خوانچے والے، کسان، چرواہے اور طوائف ہماری افسانوی دنیا کے جانے پہچانے کردار تھے۔ ان کرداروں نے ہمارے افسانوں کا ناطہ زمین سے جڑی سانس لیتی ہوئی دنیا سے جوڑ دیا تھا۔

لیکن عصمت جب ان عوامی کرداروں کی زندگی پر قلم اٹھاتی ہیں تو ہمیں ایک نرالی دنیا سے آشنا کراتی ہیں۔ وہ ان لوگوں کی باتیں کرتی ہیں جو ہماری زندگی اور خود ہماری ذات کا ایک حصہ ہیں وہ تصویر میں رنگ بھرنے اور تصویر کشی کے دیگر لوازمات پر نظر ڈالنے کی مہلت دئے بغیر ہماری مٹھ بھیڑ کسی چونکا دینے والی سچویشن سے کرا دیتی ہیں۔ جہاں ننھی کی نانی، بچھو پھوپھی، کلو کی اماں اور کلوڈپٹی موجود ہیں۔ جہاں بچوں سے بجبجاتے گھر ہیں۔ بچپن کو ترستے ہوئے بچے ہیں، کھلی اور آزاد فضا کے لئے ترستی ہوئی لڑکیاں ہیں، کالج میں پڑھنے والے جنس زدہ لڑکے، مذہب، توہمات اور رسم و رواج کی پاسداری کرنے والی بوڑھی عورتیں ہیں غرض کہ مسلم مڈل کلاس طبقے کی محرومیاں، گھٹن، استحصال، زندگی، عیاریاں اور مکاریاں، آزادانہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنے کھڑی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے عصمت چغتائی کے فن کے مقابل باغی کا لفظ ہمیشہ بہت محدود اور کمتر محسوس ہوا۔

عصمت چغتائی کے انحراف کا ایک صحت مند پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنی بات کو منوانے کے لئے کبھی کھوکھلی جذباتیت کا سہارا نہیں لیا۔ کبھی پروپیگنڈہ یا نعرے بازی کی سطح پر نہیں آئیں۔

کھوکھلی جذباتیت، ان کے یہاں سفاک لب ولہجہ میں سامنے آتی ہے جب چوتھی کے جوڑے کی تمنا میں خالہ کفن پھاڑتی ہیں یا ننھی کی نانی اپنے خالق کے حضور میں کھڑی ہے یا پھر دوزخی کا وہ کردار جو مستقل بیمار گھر کے ایک کونے میں بستر پر پڑا زندگی سے چومکھی لڑ رہا ہے۔ بیچارگی اور بے بسی کو بڑھاوا دینے والی جذباتیت کی ان کے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

سچ خواہ کتنا کڑوا ہو، انہیں ہمیشہ اس مٹھاس سے زیادہ عزیز رہا جس میں ریاکاری اور منافقت کی آمیزش ہو۔ ان کی جذباتیت کسی طرح کی بے کسی محرومی اور ریاکاری کو بڑھاوا نہیں دیتی ہے۔ دوزخی، ننھی کی نانی اور چوتھی کا جوڑا لکھنا اور اتنے بے رحم انداز سے لکھنا کہ زندگی بھی چند لمحوں کے لئے ٹھٹھک کر کھڑی ہو جائے، عصمت چغتائی کے علاوہ اردو میں کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ عصمت کا انحراف ہمیں ان تحریروں میں بھی ملتا ہے جن میں وہ کھلے ہوئے انداز میں زندگی کے ان مسائل کے حوالے سے بات کرتی ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے بڑے بڑوں کو پسینے آجاتے ہیں اور اسی وجہ سے عصمت چغتائی کا نام لیتے ہی ہمارے نقاد اور عام قاری بڑی جلدی ان پر عریانی، فحش نگاری اور جنس زدہ ہونے کا الزام لگا دیتے ہیں اور وہ لحاف، تل، ننھی سی جان، گیندا اور دوسرے بہت سے افسانوں کو عصمت کے فن کی شناخت بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ عصمت کے یہاں جنس کا عنصر ہے اور بہت حد تک شدید ہے لیکن اس کا مقصد جنسی افسانہ نگاری یا جنس کو ایک ہتھیار بنا کر استعمال کرنا اور لذت اندوزی کے ذریعہ اپنی بے باکی اور آزاد خیالی کا مظاہرہ کرنا نہیں ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ عصمت کے افسانوں پر مقدمہ چلے، اخبارات کا موضوع بنے، خوب خوب چرچے ہوئے جن کی گونج آج بھی سنائی دے جاتی ہے۔

لیکن یہ بھی ایک سچائی ہے کہ عصمت نے اپنی تحریروں کے ذریعہ جنس جیسے نازک موضوع کی سچائی ہمارے سامنے رکھی۔ ان کی تحریروں میں جنس کا صحت مند رخ ہمارے سامنے آیا۔ عصمت نے میرے خیال میں ایک قابل احترام خدمت یوں انجام دی کہ پرانے تمام رویوں سے انحراف کرتے ہوئے پہلی عصمت جنسی

معروض کے بجائے انسانی قدر عطا کی۔ مردوں کے قائم کردہ معاشرہ میں عورت کے متعلق مردوں کے عام مفروضہ جنسی رویوں کے خلاف آواز بلند کی اور اس احساس کو عام کیا کہ عورت کی عصمت اور عفت کا معاملہ، شرم وحیا کے بندھن، نسائیت کے دوسرے تمام مفروضے ہمارے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں۔ عصمت کی تحریروں میں عورت ہونا، اس کی قوت ہے۔ مامتا اور نسائیت اس کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ عصمت نے نہ صرف ان ذہنی رویوں سے انحراف کیا جس میں عورت محض آلۂ جنس تھی۔ عصمت نے اس عورت کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا جن سے مردانہ پندار کی تسکین اور نسوانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ وہ بڑی چالاکی سے ہمارے دلوں میں موجود روایتی اور کرم خوردہ رویوں کو مشکوک کر دیتے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے ساختہ اور پرداختہ تصورات کو ایک بار پھر پرکھنے کا حوصلہ فراہم کرتی ہیں۔ عصمت کو جنس زدہ کہنا اس کے فن کی عظمت سے انکار کرنا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ عورت کے وجود سے لپٹے ان تصورات سے کراہیت پیدا کرنا چاہتی ہیں جن کے تلے عورت کی انسانیت دفن ہو چکی ہے۔ یہی چیز ان کی فکر کو پختگی اور بے باکی دیتی ہے۔ جب عصمت کے افسانوں کی تقلید میں دوسرے افسانہ نگاروں خاص کر خاتون افسانہ نگاروں نے جنس کو فن کی سطح پر لانے کی کوشش کی تو یہ بات واضح ہوگئی کہ عصمت کے افسانوں کی دلکشی کا راز دراصل کیا تھا۔ وہ راز انسانی رشتوں اور زندگی پر یقین تھا۔ عصمت کے افسانوں کے سماجی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلو کرداروں اور کردار کے مسائل کو سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔

مثلاً 'دو ہاتھ' میں کوٹھی کا جمعدار رام اوتار جب ڈیڑھ سال بعد واپس آیا تو اس کی بیوی کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا۔ کوٹھی کا ہر فرد اپنی اپنی فکر کے مطابق عام طور پر رام اوتار کو اس کی بیوی کی آوارگی کا یقین دلانا چاہتا ہے اور بچے کے ناجائز ہونے پر روز دیتا ہے مگر رام اوتار کا ایک جملہ اس مسئلے کو دنیا کے سب سے اہم مسئلے سے جوڑ کر کہانی کو غیر معمولی بلکہ دنیائے ادب کا شاہکار افسانہ بنا دیتا ہے۔ رام اوتار مالک کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بچے کی چھوٹی چھوٹی مٹھیاں کھول کر اس کے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے:

''مالک یہ دو ہاتھ ہیں۔ دنیا کا میلا ڈھوئیں گے۔ یہ ہاتھ محنت کریں گے، کسی کا بڑھا پار کر دیں گے۔''

یہ جمود آشنا، تضاد بھری ہوئی زندگی کے اقدار ہیں۔ یہ اصول ان لوگوں نے بنائے ہیں جن کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں۔ جھوٹ اور کھوکھلا پن عصمت کے نزدیک سب سے بڑی اخلاق گراوٹ ہے۔ اس لئے وہ ان پر ضرب لگاتی ہیں۔ موضوعات کے علاوہ عصمت کا اسلوب بھی تیکھا اور دھاردار ہے۔ عصمت کی تخلیقی طاقت کا راز تو ان کے اسلوب اور زبان میں ہے۔ عصمت نے اپنے لئے جس لب ولہجہ اور تیور کو اپنایا وہ عام روش سے بالکل الگ ہے۔ زبان طنز کے زہر میں بجھی ہوئی ہے اور عصمت مسکرا مسکرا کر حقیقت بیان کر رہی ہیں۔

وہ بڑی سے بڑی بات بے باکی سے کہنے کا حوصلہ رکھتی ہیں، سنجیدہ موضوعات میں بڑی دیدہ دلیری سے مزاح کی آمیزش کا ہنر انہیں کا حصہ ہے۔ چونکہ مزاح ان کی فطرت کا ایک حصہ تھا اس لئے یہ ظرافت ان کی شخصیت کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ 'ننھی کی نانی' کے ساتھ عصمت نے جو ظالمانہ رویہ اپنایا اس میں بے رحمی کے ساتھ جھلاہٹ بھی ہے۔ عورت کی تذلیل پر خدا خون کے آنسو بہا رہا ہے اور عصمت ہنس رہی ہے۔ یہ وہ ہنسی ہے جہاں ہنسنے کے بعد دل چاہتا ہے کہ دل کھول کر رو یا جائے۔

عصمت کی اکثر کہانیاں واحد متکلم میں لکھی گئی ہیں۔ آپ بیتی کے انداز میں کہی گئی کہانیوں میں ان کا اسلوب مزید تیکھا اور جاندار ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ٹیڑھی لکیر عصمت کی آپ بیتی ہے۔ عصمت چغتائی کے غیر رسمی اسلوب کی سب سے بڑی قوت یہ ہے کہ زندگی میں جیسی نظر آتی ہیں اور جس طرح زندگی سے پیش آتی ہیں، یہاں بھی بالکل ویسی ہی ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا ان کی اپنی دنیا ہے۔ مزاح کے ساتھ جھلایا ہوا اسلوب ملتا ہے اور یہی جھلاہٹ ان کے کرداروں میں سمائی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے عصمت کا اسلوب سانس لیتا ہوا اسلوب ہے۔

عام راستوں سے انحراف کی حیرت ناک مثال ان کا خاکہ 'دوزخی' ہے۔ یہ اردو کا عدیم المثال خاکہ جو موضوع کے لحاظ سے المیہ ہے مگر طربیہ کی بہترین مثال ہے۔ یہاں ایسی سفاک جذباتیت ملتی ہے جس کی ہولناکی اپنی انتہا کو پہنچ کر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ یہ وہ ظرافت ہے جہاں تندیٔ بادِ صبا سے آبگینہ پگھل رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ عصمت نے کسی بھی سطح پر مذہب، سماج، فلسفہ اور آدرش کی طفل تسلیوں کو قبول نہیں کیا، اپنے مسلک پر ہمیشہ ڈٹی رہیں، جس چیز نے رکاوٹ ڈالی اس کے بخیئے ادھیڑ کر رکھ دئے۔ زندگی بھر چوکھی لڑتی رہیں۔ اپنی ضدی طبیعت، اختلاف اور انحراف اور انکار کی وجہ سے بڑے نقصان اٹھائے مگر کہیں سمجھوتہ نہیں کیا، انکار باقی رہنا چاہئے، اپنی امیج بکھرتی ہے تو بکھر جائے۔ امیج کی پرواہ انہوں نے یوں بھی کبھی نہیں کی۔

دراصل عصمت چغتائی کا قد ان تمام پیمانوں سے بڑا تھا جن سے ہم تمام عمر ان کو ناپتے رہے اور ہمیشہ ناکام رہے۔ ان کی فکر ان سب سے ماورا تھی۔ عصمت چغتائی نے ہماری فکر کی بیداری کا کام ہی نہیں کیا بلکہ پارینہ عقائد اور توہمات سے آزاد کرانے کا کام بھی کیا۔ تمام بندشوں سے دور وقت اور حالات کے جبر سے منکر ایک ایسا رویہ دیا جس کے ہم ہمیشہ احسان مند رہیں گے کیونکہ کبھی کبھی فکر کو آزاد کرانے اور ذہنوں کو مرتب کرنے میں ایک امیج، ایک کردار، ایک تجربہ وہ کام کرتا ہے جو پورا نظام فکر نہیں کر سکتا۔

❑❑❑

عصمت چغتائی کے افسانوں میں ضعیف عورتیں

ندا موئید
ریسرچ اسکالر، الٰہ آباد یونیورسٹی
موبائل: 7052088744

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عصمت چغتائی لڑکی عورت اور نوجوان ملازماؤں کی افسانہ نگار ہیں ان کی کہانیوں میں جنسی لذت تلاش کر کے اس کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیا جاتا ہے اور ان کو بیباک بے دھڑک افسانہ نگار کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔لیکن عصمت نے بچّوں، بڑوں، بوڑھوں سبھی پر کہانیاں لکھی ہیں۔ان کی کہانی کا میدان مسلم گھرانے کا متوسط طبقہ ہے۔ عصمت چغتائی جہاں ''بچپن'' اور ''اف یہ بچے'' جیسی کہانی لکھتی ہیں وہیں وہ ضعیف عورتوں کو بھی اپنی کہانی میں جگہ دیتی ہیں۔عصمت چغتائی ایک بھرے پورے خاندان کی بیٹی تھیں۔وہ بڑی بوڑھی عورت کی صحبت میں رہیں انہوں نے ان کے روک ٹوک کو جھیلا ان کی تہمتوں کا مذاق اڑایا، اور ساتھ ہی ان کے دکھ درد کو بھی قریب سے محسوس کیا تھا۔اسی وجہ سے جہاں انہوں نے ضعیف عورتوں کو غصہ نفرت کو پیش کیا ہے۔وہیں ان کی محبت کو بھی افسانے میں جگہ دی ہے ان کے اندر کے کرب کو محسوس کیا اور سماج کے سامنے پیش کر دیا۔

عام خیال ہے کہ عصمت کی کہانی کی ہیروئن عشق لڑاتی پھرتی ہے اس کے پاس اور کوئی کام نہیں ہے۔ دراصل عصمت چغتائی حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں انہوں نے سماج کی حقیقت درد و کرب دبے کچلے معاشرے پر ہونے والے ظلم کو پیش کیا ہے۔عورت کے نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دکھایا ہے کہ عورت صرف ایک ملازمہ یا دوسروں کا خیال رکھنے والی جذبات سے عاری مشین نہیں ہے البتہ اس کی بھی خواہش ہیں جن کا احترام کرنا چاہئے۔

عصمت کی کہانیوں میں تخیل کا عمل دخل کم ہے وہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی وہ اپنے آس پاس کے کردار اور واقعات کو جانچ پرکھ کر افسانے کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں عصمت نے صرف نواب زادی، بیگم اور کم سن کمزور لڑکی کی ہی کہانی نہیں لکھی بلکہ پس ماندہ طبقہ کی مظلوم محکوم بوڑھی عورت کو بھی اپنی تحریر میں جگہ دی ہے۔''ننھی کی نانی'' افسانے کا شمار عصمت کی مشہور تخلیق میں ہوتا ہے یہ افسانہ محلہ ٹولے میں رہنے والی غریب مظلوم محکوم بوڑھی بیوی کی داستانِ حیات ہے اس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح دل میں درد کا طوفان چھپا ہونے کے باوجود جینے کا بہانہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔

''ننھی کی نانی'' افسانے کے آغاز میں عصمت لکھتی ہیں

> ''ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔لوگوں نے کبھی انہیں اس نام سے یاد نہ کیا لونڈیا کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دنوں ''پترے کی بہو'' کہلائیں پھر بسم اللہ کی ماں کے نام سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو ننھی کی نانی کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔''

اس اقتباس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عورت کی زندگی تو اپنی ہے لیکن دوسرے کے نام سے پہچانی جارہی ہے۔وہ ساری عمر اپنی بدنصیبی پر روتی پیٹتی رہی مگر اس کی آہ و بکا نہ خدا نے سنا اور نہ ہی کسی انسان نے کان دھرے۔اور اس نے یوں ہی روتے بسورتے زندگی گذار دی پہلے شوہر کھویا پھر بیٹی اور بڑھاپے میں نواسی سے ہاتھ دھویا۔ ہر غم کو آخری غم سمجھتی لیکن جب تک موت نہ آگئی کوئی غم آخری نہ ہوا۔

ننھی کی نانی زندہ رہنے کے لئے گھروں میں اوپر کا کام کرتی تھیں وہ چھوٹا تو کچھ سال ماما گیری بھی کی لیکن جب یہ پیشہ چھوٹ گیا تو محلہ میں مخبری کا کام شروع کیا اور بات ادھر ادھر کر دو وقت کی روٹی حاصل کر لیتی لیکن یہ کوئی مستقل کام نہیں تھا اس لئے اس نے بھیک مانگنا شروع کر دیا۔نانی بے بس تھی اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا جو کچھ کام آتا۔اس کا شوہر مر چکا تھا اس کی بیٹی بچی کی پیدائش پر چل بسی نانی جس ننھی کے سہارے زندگی گذار رہی تھیں اس پر خاص نظر رکھتی تھیں۔ بہت غور و فکر کے بعد اس کو ڈپٹی صاحب کے یہاں نوکر رکھ دیا اور فرشتہ صورت حیوان سیرت ڈپٹی صاحب جو کہ پروقار عہدے پر فائز نیک باز اور نمازی ہیں انہوں نے نو سالہ بچی کو اپنی شہوانیت کا شکار بنایا وہ جانتے تھے ننھی تو بے بس ہے اور اس کی نانی تو ان کے ٹکڑوں پر پلتی ہے۔ڈپٹی صاحب انسان کی شکل میں بھیڑیا تھے اور معاشرے پر بدنما داغ انہوں نے ایک بچی کی زندگی تو خراب کی ہی ایک بوڑھی عورت کی مظلومیت کا فائدہ اٹھایا۔عصمت طنز کرتی ہیں۔

> کہتے ہیں بڑھاپے کے آسیب سے بچنے کے لئے مختلف ادویات اور طلاؤں کے ساتھ حکیم وید چوزوں کی یخنی تجویز فرماتے ہیں نو برس کی ننھی جوزہ ہی تو تھی۔''

اس طرح ایک غریب بے ضرر لڑکی بے سہارا لڑکی سماج کی بے رحمی اور استحصال پسندی کا شکار ہوجاتی ہے۔ اور اب ہر کسی کو ننھی میں امید دکھائی دیتی ہے۔ مفلسی اور بھوک کی ماری ننھی پھسل جاتی ہے اور ایک روز بھاگ جاتی ہے اور نانی اس کی یاد میں آہیں بھرتی ہیں آنسو بہاتی ہیں اور ہر کسی سے سوال کرتی ہیں کہ میری ننھی کہاں ہے۔ کوئی کہتا لاہور میں دکھائی دی کوئی ممبئی تو کوئی کلکتہ میں دیکھنے کا دعویٰ کرتا حادثہ کی ماری نانی جو کہ پہلے سے ہی ٹوٹی بکھری تھیں اس صدمے سے خبطی ہوگئیں۔ لیکن زندگی تو بسر کرنی تھی جیسے بھی گذرتی رہی۔عصمت چغتائی نے ''چوتھی کا جوڑا'' افسانے میں ایک ضعیف ماں کی مجبوری لاچاری کو پیش کیا ہے کہ امید بندھتی ٹوٹتی رہتی ہے بڑھاپا آجاتا ہے لیکن امید کبھی بر نہیں آتی بلکہ ان کی بیٹی ہی موت کے آغوش میں چلی جاتی ہے۔ ایک ماں جو ہر روز اپنی بیٹی کے چوتھی کے جوڑے کی فکر میں رہتی ہے۔ سیتی پروتی ہے۔ کبھی کپڑا کم ہوجاتا ہے کبھی جوڑا تیار ہوکر پرانا ہوجاتا ہے لیکن شادی نہیں ہوتی۔ آخر انہیں بوڑھے ہاتھوں کو ایک دن اسی بیٹی کے لئے سفید کفن تیار کرنا پڑتا ہے۔ کتنا تکلیف دہ ہے کہ ایک ماں اپنے ہی ہاتھوں اپنی بیٹی کے لئے کفن تیار کرے۔ عصمت چغتائی کا یہ افسانہ اپنے اندر بہت درد وکرب سموئے ہوئے ہے اور مسلم معاشرے کے غربت زدہ طبقے کی نامرادیوں اور محرومیوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور اس افسانے میں حالات کی ستم ظریفی کے سبب ایک بوڑھی ماں مرمر کر جینے پر مجبور ہے بیماری میں شوہر مرگیا۔ ان کے اندر درد کا طوفان چھپا ہے پھر بھی ایک امید ہے۔ لیکن بیٹی کے گذر جانے پر ایک امید بھی ناتمام ہوجاتی ہے یہ کہانی صرف اماں بی کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا المیہ ہے۔

اسی طرح ان کا ایک اور ضعیف کردار ''بچھو پھوپھی'' کا ہے جو افسانہ ''بچھو پھوپھی'' کا مرکزی کردار ہے۔ بچھو پھوپھی کی شخصیت بھرپور اور جاندار ہے انہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ چغتائی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جن کے آباء واجداد دور دراز کے ملک سے ہندوستان آئے اور کئی پشت حکمرانی کی وہ لحیم شحیم سرخ رو اور گرج دار تھے وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور بچھو پھوپھی میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ وہی طنطنہ وہی دبدبہ اور مزاج میں وہی شدت تھی زبان بے لگام اور غم وغصہ میں وہ حد سے گذر جاتی تھیں جوتھان لیتی وہ کر گذرتیں۔

''ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار انگل چوڑی کلائی، سیر سا کلا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت بھاری سی ٹھوڑی اور آواز تو ماشاءاللہ ابا میاں سے ایک سر نیچی ہی ہوگی۔''

اس افسانے میں رومان نہیں ہے نفرت ہے۔ کوسنے ہیں۔ گالیاں ہیں اس کے بعد بھی محبت ہے۔ انسانیت ہے۔ بھائی بہن کا پیار ہے ایک طرف اپنے بھائی کو گالی دیتی ہیں دوسری طرف شوہر سے بھائیوں کے اثر ورسوخ کا ذکر کرتی ہیں۔

بچھو پھوپھی بچپن سے ہی تیز طرار تھیں۔ لیکن وقت گذرتا گیا پھوپھی عام عورت کی طرح حالات کے ستم کی شکار ہوگئیں۔ لیکن انہوں نے حالات کے آگے سر نہیں جھکایا اور جب ان کا شوہر ان کی موجودگی میں مہترانی سے رشتہ بنالیتا ہے تو وہ بلا توقف اپنی چوڑیاں توڑ دیتی ہیں رنگا دوپٹہ اتار پھینکتی ہیں سفید لباس پہننے لگتی ہیں شوہر سے ہمیشہ کے لئے رشتہ ختم کردیتی ہیں اور اس کا ذکر ''مرحوم'' یا ''مرنے والا'' کہہ کر کرنے لگتی ہیں بچھو پھوپھی ایک غیرت مند اور حساس عورت کا کردار ہے جسے شوہر کی بے راہ روی قطعاً گوارہ نہ تھی ان میں ارادہ کی پختگی ہے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا دم خم ہے۔ جب ان کی بیٹی کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوجاتی ہے ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے یہ دکھ ان پر کسی پہاڑ سے کم نہ تھا۔ لیکن وہ اپنی بیٹی داماد سے رشتہ منقطع کرلیتی ہیں۔ شوہر کی بے راہ روی پر اس سے رشتہ ختم کرلینا اور بیٹی کی نافرمابرداری پر اس سے دوری بنالینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسے موقعوں پر عورتیں بے بسی سے حالات کے سامنے سر جھکا کر خاموش ہوجاتی ہیں لیکن پھوپھی مشکل وقت میں ہمت نہیں ہارتیں بچھو پھوپھی کا طنطنہ اور زبان کی تیزی حالات کی وجہ سے وقت کے ساتھ تیز ہوتا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ نرم خو گداز دل کی مالک تھیں جہاں وہ اپنے بھائیوں کو گالی دیتی وہیں ان کے دکھ درد میں دوڑ جاتیں جب ان کے بھائی انہیں عیدی دیتے فوراً پھینک دیتی اور ان کے جانے کے بعد عیدی کے دو روپئے آنکھوں سے لگا کر گھنٹوں رویا کرتیں پھوپھی کی زبان بھلے ہی تیز تھی لیکن دل نرم ونازک جذبات سے معمور تھا۔

اس کہانی کے آخر میں دمِ مرگ ابا میاں پھوپھی کو بلاتے ہیں کہ بادشاہی خانم دم آخر ہے آؤ دل کا ارمان پورا کرلو اور وہ روتی دھوتی سینہ کوبی کرتی گرتی پڑتی ان کے یہاں پہنچ جاتی ہیں۔

ان کے آنسو میں نہ جانے کتنی دعائیں پنہاں تھیں گھر کے لوگ حیران تھے کہ آج ان کی زبان سے ایک بھی کوسنا نہ نکلا صرف ابا میاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھیں جہاں بہن ہمیشہ بھائی سے روٹھتی تھی آج اس بھائی سے زندگی روٹھ رہی تھی اور روٹھنے والی بہن منانے آئی تھی۔

عصمت کی اس کہانی کا آخری جملہ کافی اہم ہے۔

''سچ ہے بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں''

عصمت کے ان افسانوں میں نہ ہیرو ہے نہ ہیروئن اور نا ملازمائیں بلکہ ضعیف عورتیں ہیں جن پر پوری کہانی منحصر ہوتے ہوئے بھی یہ افسانے شروع سے آخر تک ایک مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے ہیں یہ تینوں کردار اپنے عہد، سماج، اور طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کردار محبت مظلومیت کے ساتھ انسانیت کا مجسمہ ہیں۔

❑❑❑

عصمت چغتائی کی لکھنؤ آمد: یادیں اور ملاقاتیں

عصمت آپا سے میری ملاقات اور اپنائیت کے رشتے کتنے پرانے ہیں مجھے یاد نہیں، ان کی تحریروں نے میرے ذہن پر کتنے اور کیسے اثرات مرتب کئے، یہ یاد ہے۔ جب سے انہیں پڑھا تب سے ایک رشتہ، ایک یقین ہمارے درمیان تھا۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، پہلے پہل عظیم بیگ چغتائی کی چھوٹی بہن کی حیثیت سے ان سے میرا تعارف ہوا تھا۔ 'شریر بیوی'، 'انگوٹھی کی مصیبت'، 'کولتار'، 'کھرپا بہادر' والے عظیم بیگ چغتائی جن کی تحریروں میں بڑی عجیب سی چاشنی تھی۔ ان کے یہاں ایک نئی عورت سے تعارف ہوا جو حسن و جوانی، نیکی، وفاشعاری، صبر و برداشت کے علاوہ کچھ اور خوبیاں رکھتی تھی۔ یہ ایک ہنستی، بولتی، جیتی جاگتی مخلوق تھی جس میں شوخی، شرارت اور ذہانت تھی۔ حالات سے مورچہ لینے کا حوصلہ تھا، جیت جانے کا شوق بھی تھا اور عورت کی ایک ایسی تصویر اجاگر ہو رہی تھی جس میں اس کا باشعور اور ذہین ہونا اتنا ہی نمایاں تھا جتنا زندہ ہونا۔ یہ تصویر زیادہ خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔

اسی شعور و فکر کو ذہن میں رکھ کر جب میں نے عصمت چغتائی کو پڑھا اور رفتہ رفتہ ان کی تحریروں سے بے باکی، آزاد خیالی کی بات سمجھ میں آتی گئی، اس وقت عصمت آپا سمجھ میں آئیں۔ عصمت کے یہاں جو انکار اور مروجہ طریقوں اور روایتی فکر سے انحراف ملتا ہے، اس وقت تک قابل قبول نہیں تھا۔ یہ اسی شعور کا ایک حصہ ہے جسے بغاوت کہہ دینا ان کی بات کو کمزور بنا دیتا ہے۔

عصمت چغتائی اپنے خاص انداز میں

دراصل وہ ایک صاف دل، جرأت مند، بے لاگ اور ہوشیار خاتون تھیں۔ انہوں نے زمانے کے بہت سرد و گرم دیکھے۔ بہت مشکلوں کا سامنا کیا۔ یہ ان کی حوصلہ مندی اور ایمانداری ہے کہ وہ کسی کو کبھی خاطر میں نہ لائیں۔

عصمت آپا سے ملاقاتوں کے بعد ان کی ذات اور ان کے سوچنے کے طریقوں کو سمجھنے کے بعد دل ان کی صاف گوئی اور بہادری کا اور بھی قائل ہو گیا۔ یہ یقین ہوا کہ یہ وہ نہیں ہیں جن کے کردار اور گفتار میں فرق ہوتا ہے۔ عصمت آپا وہی تھیں جو وہ ساری عمر کرتی اور کہتی رہی تھیں۔ ہر کمزور اور لاچار کی طرف سے وہ آستینیں چڑھا کر لڑنے کو تیار تھیں اور کسی ظالم سفاک کو بخشنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔

ایک جگہ ایک صاحبہ نے ان کو عورتوں کا وکیل اور جنگ کا سپاہی وغیرہ کہہ کر تعارف کرایا تھا۔ انہوں نے بیچ میں ہی ٹوک دیا، 'میں عورتوں کی وکیل نہیں، بھئی جس پر زیادتی ہوگی، اس کی مدد میرا فرض ہے اور پھر عورتوں کی چالاکیوں، عیاریوں اور ستم انگیزیوں کے وہ واقعات سنائے کہ محفل کا موڈ ہی بدل گیا۔ سب منھ دیکھ رہے تھے اور وہ ان مردوں کی مظلومیت کی داستان سنا رہی تھیں۔ ان عورتوں کی کہانی سنا رہی تھیں جو اپنی چالاکیوں سے مردوں سے

اپنے بچے پلواتی ہیں۔ دن رات مزدوروں کی طرح بے چارہ محنت کرتا ہے اور وہ اپنے نازنخروں کے بل پر زندگی بھر عیش کرتی ہیں۔

عصمت آپا کی تہہ در تہہ سچائی کو سمجھنے کے لئے دل کا سچا ہونا بھی ضروری ہے، اسی لئے اگر انہیں سمجھا نہیں جا سکا ہے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کی فکر کی تفہیم کی کوششوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کبھی بے لاگ رویوں کو وقت نے پہچانا تو عصمت کی بے چینی بھی پہچان لی جائے گی۔

عصمت آپا سے میری بے تکلفی یا آپ اسے دوستی بھی کہہ سکتے ہیں، کا رشتہ استوار ہونے میں وقت ہی نہیں لگا۔ پتہ نہیں دوستی کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی تھی۔ ادبی جلسوں میں ملاقاتیں اکثر ہوئی تھیں۔ میری طالب علمی کے زمانے میں عصمت آپا میرے کالج کرامت حسین مسلم گرلس ڈگری کالج کی پرنسپل مس وسیم النساء آفریدی کی مہمان ہوتی تھیں۔ مس وسیم ان کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ ایک بار اپنی بیٹی سبرینا کا داخلہ آئی ٹی کالج میں کروانے کے سلسلہ میں کئی دن رہیں۔ ہاسٹل کی بالکنی کے ایک کونے سے مس وسیم کا سرسبز لان دکھائی دیتا۔ دیر رات لان پر گہما گہمی رہتی۔ ہاسٹل سے کھانے کی ڈھکی ہوئی کشتیاں جاتی تھیں۔ ان کی دوست رضیہ سجاد ظہیر بھی وہیں اردو کی لکچرر تھیں۔ عصمت آپا کا افسانہ 'چاپڑے' وہیں کالج کی ادبی انجمن 'کہکشاں' کی نشست میں سنا تھا۔ عصمت آپا کی اس زمانے کی ایک تصویر میرے پاس ہے۔ شاہد لطیف کے انتقال کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔

ادبی جلسوں میں شمولیت دھیرے دھیرے آپسی پہچان بنتی گئی۔ بہرائچ میں عصمت آپا کا بچپن گزرا تھا۔ وہ بہرائچ کو بہت یاد کرتی تھیں۔ بہرائچ کے بزرگ سید سالار مسعود غازی 'بالے میاں' کو اپنا 'بوائے فرینڈ' بھی کہتی تھیں۔ میں نے ان سے بہرائچ لے چلنے کا وعدہ کیا تھا، شائد بہرائچ جانے کے شوق میں ہماری دوستی آگے بڑھی۔ ایک منسٹر صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کی اتنی شاندار شخصیت ہیں کہ آپ کو تو کہیں گورنر ہونا چاہئے۔ فوراً کہا کہ 'بہرائچ کا گورنر بنوا دیجئے۔' پھر گردن گھما کر کہا 'بڑا مزہ آئے گا جب وہاں تاش کی بازیاں جمیں گی۔'

رام لعل کے گھر پر ایک ادبی نشست کی تیاری میں مصروف عصمت چغتائی اور صبیحہ انور

فلم 'جنون' کی شوٹنگ کے زمانے میں جب وہ لکھنؤ میں کلارکس اودھ میں ٹھہری تھیں، کئی بار میرے غریب خانے پر تشریف لائیں اور ایک بار رات کے کھانے پر رام لعل، عابد سہیل اور کئی لوگوں کو کھانے پر خود مدعو کیا تھا۔ پھر رات کو دیر ہوگئی تو شیام بینگل کو فون کر کے بتایا کہ میں صبح آؤں گی۔ شیام بینگل کو اول دن سے میری دوستی پسند نہیں آئی تھی۔ میں ان کے کام میں مخل ہو رہی تھی مگر شاید عصمت آپا کو کھانے کے دوران خیال آیا کہ یہ کوفتے صبح باسی روٹی کے ساتھ بہت مزہ دیں گے۔ ان سے کہا 'کل تو میرا کوئی کام نہیں ہے۔ میں صبح ناشتے کے بعد آرام سے آؤں گی۔' عصمت آپا کھانے کی بیحد شوقین تھیں۔ کھانے سے پہلے ہمیشہ پوچھتیں کہ 'آج میٹھے میں کیا ہے؟'

یہ ملاقاتیں فلم 'جنون' کے زمانے میں اکثر رہیں۔ فلم میں ان کا سفید غرارہ بڑے سائز کا سل گیا تھا جسے سنبھالنے میں ان کو دقت ہوتی تھی۔ وہ اس غرارے کو شیخ عبداللہ کے سائز کا غرارہ کہتی اور خود بھی ہنستی تھیں۔ ایک جگہ انہوں نے گفتگو کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ صبیحہ کے گھر کی بے تکلفی میں Warmth بہت ہے۔ اور میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ یہ بھی کہ صبیحہ کے گھر میں کتابیں ہر طرف ہر جگہ ملتی ہیں جیسے پھول بکھرے ہوں اور میں گھبرا گئی تھی کیونکہ میرے میاں میرے گھر بھر میں کتابیں پھیلانے سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ اس زمانے میں فون کا رواج نہیں تھا۔ عموماً خط ہی آتا تھا کہ فلاں تاریخ کو فلاں ٹرین سے پہنچوں گی۔ میں اور انور ان کو لینے اسٹیشن جاتے۔ ایک بار علی سردار جعفری کے جشن میں بلرام پور جانے کے لئے صرف ایک دن رکی تھیں۔ کرشن چندر کی پہلی برسی پر اردو اکیڈمی کی افسانوی نشست کے پروگرام اور پریم چند رصدی کے سمینار کا قیام بہت تفصیل سے آج بھی یاد ہے۔ عصمت آپا کے حوالے سے بہت بڑی شخصیتیں ان سے ملنے آئیں اور میری اور میرے گھر کی عزت افزائی ہوئی تھی جس میں جیلانی بانو، انور معظم، قمر رئیس، عمیق حنفی وغیرہ بھی تھے۔

اسی پروگرام میں شرکت کے لئے عینی آپا بھی آئی تھیں اور ریور بینک کالونی میں اپنے عزیز کے یہاں ٹھہری تھیں۔ ایک بار میں نے انہیں بھی رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ انہوں نے آنے کا وعدہ کیا، ان کی قریبی دوست بانو داراب وفا صاحبہ بھی موجود تھیں۔ دونوں نے ساتھ آنے کا پروگرام بنایا مگر عینی آپا کو اچانک یاد آیا کہ عصمت آپا میرے یہاں مقیم ہیں، پھر فوراً انکار کر دیا۔ 'میں تو نہیں آسکتی پھر کبھی آؤں گی۔ پلیز مجھ سے اصرار مت کیجئے۔' میں گھبرا گئی، جب وہ کسی کام سے اندر گئیں تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے بانو آپا سے پوچھا، 'یہ کیا ہوا؟' بانو آپا نے مایوسی سے اپنی کنپٹی پر انگلی رکھ کر گھمائی۔ ہم لوگ ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بانو آپا لکھنؤ والوں کی بے حسی اور بے دلی پر اظہار افسوس کرتے کرتے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ عینی آپا نے بانو آپا کی طرف دیکھا اور کنپٹی پر انگلی رکھ کر گھمائی اور ہنسنے لگی تھیں۔

رات کو عصمت آپا نے کھانے کے بعد مجھ سے پوچھا، تم نے عینی کو کیوں نہیں بلایا وہ بھی تو لکھنؤ میں ہے۔ میں یہ کیا کہتی کہ آپ کی وجہ سے انہوں نے آتے آتے منع کر دیا۔ میں نے کہا کہ آج وہ کہیں اور مدعو تھیں۔ تھوڑی دیر سوچتی رہیں پھر متاسفانہ لہجے میں بولیں، نہیں، میری وجہ سے نہیں آئی ہوگی۔ کیا کروں، اس زبان نے بہت دکھ دئے ہیں۔ میری اور عینی کی کبھی بن نہیں سکی۔ بہت بڑی افسانہ نگار ہے، میرے دل میں اس کی بہت قدر ہے۔ بڑے ماں باپ کی بیٹی، کھانا کھاتی تو کانٹے چھری اور نیپکن کے لوازمات کے اور ماں باپ کے لاڈ کے ساتھ۔ ہمارے گھر میں دس بھائی بہن کھری چارپائیوں پر اکثر پلیٹ میں اروی کا

> جب عصمت چغتائی اپنے بھائی بہنوں کا ذکر کرتیں تو ان کا چہرہ ایسا جگمگاتا جیسے کوئی شرارت یاد آگئی ہو۔

سالن اور مٹھی میں روٹی دبا کر کھانا کھاتے، بک بک اتنی کہ کسی نہ کسی کو اچھو لگ جاتا۔ پلیٹ پلنگ پر ہے اور

کرشن چندر کی پہلی برسی کے موقع پر عصمت چغتائی، صبیحہ انور، ساجدہ زیدی، خاور ممتاز اور یاد دہلوی

دوسری طرف اگر کوئی پلنگ پر چڑھ آیا تو شوربہ، بوٹی، اروی، سب ادھر ہی لڑھک جاتی۔

اگر ایک کہتا 'لعنت ہے، بھئی یہ الو کی پٹھی گھیاں روز پک جاتی ہے' تو دوسرا کہتا 'ارے یار واہ اروی

> عصمت آپا کی تہہ در تہہ سچائی کو سمجھنے کے لئے دل کا سچا ہونا بھی ضروری ہے، اسی لئے اگر انہیں سمجھا نہیں جا سکا ہے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔

گوشت، اس پر گرم مصالحہ چھڑکا ہوا اور نیبو! کیا کہنے ہیں مگر روٹیاں گرم گرم ہوں۔' تیسرا کہتا 'یار تو نرا لیچڑ ہے، گھیاں کھا کھا کر چپکو ہو جائے گا۔' عصمت آپا اپنے بچپن کے کھانے کا وقت بیان کرتے کرتے وہیں پہنچ جاتیں جہاں شور وغل اور مار کٹائی کا ماحول تھا۔

آج وہ زمانہ یاد کرتی ہوں تو ایک بات کے ساتھ دوسری بات بھی تفصیل سے یاد آتی ہے اور پھر یادوں کے قمقمے لڑیاں بن جاتے ہیں۔ عصمت آپا ہر بار اپنے پیچھے کوئی مزیدار واقعہ یا سچویشن چھوڑ کر جاتیں جو ہم ان کے اگلے قیام تک دہراتے رہتے۔

آخری بار جب وہ لکھنؤ آئیں تو ان کا قیام کچھ طویل ہو گیا تھا۔ اس وقت عصمت آپا اپنی یادداشت سے اور یادداشت ان سے کھیل رہی تھی۔ یادوں کا طوفان اٹھتا تو لگاتار گھنٹوں بولتیں۔ وقت اور موقع سے بے نیاز، سب سے دلچسپ اور جاندار یادیں بچپن کی تھیں۔ دس بھائی بہنوں کے نام بڑے پیار اور چاؤ سے لیتیں۔ ایسا لگتا، ہر کردار مجسم ہو کر سامنے کھڑا ہو گیا، زندہ، مسکراتا ہوا۔

'ہم دس بھائی بہنوں میں دو کے اولاد نہیں ہوئی۔ آٹھ کے انتیس بچے ہوئے جن میں تیرہ پاکستان چلے گئے، سولہ ہندوستان میں رہ گئے۔ عظیم بھائی کا انتقال ہو گیا۔ پارٹیشن کے بعد ایک بھائی یہاں رہ گئے۔ چار پاکستان چلے گئے۔ ہم چاروں بہنیں ہندوستان میں رہیں۔ چھ بھائیوں میں تین کا انتقال ہو گیا۔ بس ایک بھائی ہیں، مجھ سے چھوٹے، پاکستان میں، ہندوستان میں ایک بھائی ہیں، مجھ سے بڑے۔' وہ بڑے اطمینان سے پورا حساب بتا کر کہتیں 'مگر میں مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی، ایسا لگتا ہے کہیں ہم دسوں زندہ ہیں۔ ہم اب بھی چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں۔' جب وہ بھائی

’زندگی اتنی لمبی نہیں ہے، ہم ہر روز ختم ہو رہے ہیں، کون یاد کرے گا ہمیں، کس کو فرصت ہے،

بہنوں کا ذکر کرتیں تو ان کا چہرہ ایسا جگمگاتا جیسے کوئی شرارت یاد آ گئی ہو۔

عظیم بھائی کے بعد سب سے زیادہ خود سے ڈیڑھ سال بڑے شمیم کو یاد کرتی تھیں جو عمر میں بڑے ہو کر عصمت آپا سے کلاس میں پیچھے تھے۔ ان کا ذکر اس انداز میں کرتیں کہ پورا ڈرامہ بیان ہو جاتا۔ ’ان سے پڑھنے کو کہو تو جواب دیتے تین دفعہ کا کورس رٹا پڑا ہے، ذرا سی کتابیا بدل گئی ہے۔ ہم سے بچ کر کہاں جائے گی۔ اکڑ کر کہتے، کوئی مشکل سوال پوچھو۔‘

’کون سی کتابیا، یاد نہیں، پتلی سی ہے، اسی کم بخت شیکسپیئر کی، ہاں ہاں وہی میکبیتھ مگر وہ تو خاصی موٹی ہے۔ پیارے میاں الو کے پٹھے نے کتے سے پھڑوا دی۔ اب آدھے سے کم بچی ہے مگر ہمیں سب یاد ہے۔‘

’اچھا لیڈی میکبیتھ کی سولی لوکی سناؤ۔ کس کی؟ نکھٹو ڈائن کی۔ سب گدھے پن کی بکواس ہے۔ شمیم ہانکتے بہت تھے۔ ہمیشہ کہتے، جاہل لوگ ہی زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں۔‘

بھائیوں میں عظیم بھائی کا ذکر بہت بے قراری سے کرتیں۔ میرے والد کی عظیم بیگ چغتائی سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اس لئے ان سے ہمیشہ خصوصیت سے ملتی تھیں۔ جب بھی وہ سندیلے سے آتے، انہیں ضرور روکتیں اور کھانے کا اصرار کرتیں۔ یہ بھول جاتی تھیں کہ میرے والد ہیں۔ مجھ سے کہتی تھیں، ’وجاہت صاحب مجھے اچھے لگتے ہیں۔‘ میں کہتی ’مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔‘ عصمت آپا میٹھے کی شوقین تھیں، وہ عموماً

ایک خوشگوار لمحہ: عصمت چغتائی اور صبیحہ انور

سنڈیلے کے لڈو یا کوئی اور مٹھائی لاتے، بہت خوش ہوتیں۔ ’آج کیا سوغات ہے؟‘

ان سے بہت محبت سے مخاطب ہوتیں۔ بچپن کی یادوں میں عظیم بھائی، ابا اور اماں کے بعد ان کی یادوں پر اپنی پھوپھی بادشاہی بیگم کا قبضہ تھا۔ بچھو پھوپھی، ایک عورت، ایک ادھوری عورت جسے کسی نے دنیاداری نہیں سکھائی، زنانہ سیاسی ہتھکنڈے نہیں سکھائے تھے۔ بادشاہی پھوپھی کو یاد کرتے کرتے ان کے اندر کی عورت باغیانہ انداز میں جاگ جاتی تھی۔ وہ کہتیں، ’پھوپھی اماں جب جلی کٹی پر اتر آتی تھیں تو عجیب لے میں بولنے لگتی تھیں جیسے مجلس میں مرثیہ خوانی سے پہلے لہراتی آواز میں بیان پڑھا جاتا ہے۔ میں ان کے لہجے کی نقل اتارتی، ’ارے رحیم بیگ کی اکلوتی بیٹی اور تین جفادری بھائیوں کی لڑاکا بہن اور مجھ معصوم بھتیجی کی واحد پھوپھی، چائے ناشتے کا تو مجھے غم نہیں ہے، پانی تو پینے دے گی کہ دریائے فرات پر بھی شمر کی فوجوں کی ناکہ بندی ہے۔‘ بچھو پھوپھی میرے کھانے پینے پر ٹوکتیں، ’لونگلو، ذرا بھی شرم نہیں ہے۔‘

عصمت آپا اپنا جواب دہراتیں۔

’ہم مغل تکلف کے عادی ہوتے تو ہندوستان فتح کر کے حکومت نہ کر پاتے، لٹیرے تکلف نہیں کرتے۔‘ وہ بڑی شان سے اپنی بات دہراتی تھیں۔ بڑھاپا دھیرے دھیرے بچپن کی طرف لوٹ رہا تھا اور اس کی چمک دوسری تمام یادوں کو مدھم کر رہی تھی۔ عصمت آپا کی یادوں اور باتوں کو دہراؤں تو شاہد لطیف صاحب کا ذکر ہمیشہ بڑی

صبیحہ انور کے گھر پر ایک ادبی نشست، عصمت چغتائی، صبیحہ انور، سلام صدیقی،

پلٹ کر کوئی نہیں دیکھے گا، تمہارا کام لکھنا ہے، لکھتے رہو۔ یہ مت سوچو کہ کوئی یاد کرے گا'

محبت سے کرتیں۔ ان کی سادگی اور برداشت کے مادے کو بہت یاد کرتیں۔ زیادہ تر 'شاہد بیچارے' کہتیں اور ان کے خیال میں وہ عورتیں بیحد مکار اور چالباز ہوتی ہیں جن کی اپنے میاں سے لڑائی نہیں ہوتی ہے۔ مجھ سے ایک دن سوال کیا کہ کیا تم دونوں کی لڑائی نہیں ہوتی۔ میں ایک مہینے سے دیکھ رہی ہوں۔ میں نے کہا، 'نہیں، خدا نہ کرے، لڑائی کیوں ہوگی۔ ویسے کبھی کسی بات پر اختلاف تو ہوتا ہے۔' چپ ہو گئیں۔ بعد میں کہنے لگیں کہ اتنی مصلحت اور ہوشیاری بھی خطرناک ہے۔ تم اتنی چالاک ہو، مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں ہنسی تو خود بھی دیر تک ہنستی رہیں۔ بولیں 'یہ چالاکی تو ہے کہ دوسرے کی ہاں میں ہاں ملا دی چاہے بات صحیح ہو یا غلط!'

اور میں نے سوچا تھا کہ بات تو ایمانداری کی کہہ رہی ہیں۔

رام لعل کے گھر پر عصمت چغتائی

اپنی کتابوں میں 'ایک قطرہ خوں' بہت دل لگا کر پڑھتی رہی تھیں۔ پڑھنے اور لکھنے کا طریقہ عجیب تھا، اوندھے لیٹ کر گاؤ تکیے پر کتاب پھیلا کر پڑھتی تھیں۔ ایک بار ہم لوگوں کے ساتھ حضرت گنج سے واپس آ رہی تھیں۔ شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ پر 'جشن زینب' کا بینر دیکھ کر بے قرار ہو گئیں کہ مجھے شرکت کرنا ہے۔ محفل شروع ہو چکی تھی، سڑک تک مجمع تھا۔ ان کی ضد تھی کہ مجھے جانے دو، حضرت زینب کی کیفیت میں بتاؤں گی اور ماتم کے انداز میں ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔ میں نے سمجھایا، آپا یہ لکھنؤ ہے۔ یہاں عبا اور قبا والے مولاناؤں کے سامنے آپ کا جانا مناسب نہ ہوگا۔ کیوں ان کی مجلس خراب کیجئے گا مگر میری بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس وقت ناراض ہو گئیں۔ خود اپنی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی تھیں۔ 'دو ہاتھ' افسانہ مجھے پورا پڑھ کر سنایا تھا۔ بعض جملے بار بار پڑھے تھے۔ اس مجموعہ میں جگہ جگہ اضافے بھی کئے تھے۔ وہ مجموعہ میں نے بہت احتیاط سے اٹھا کر رکھ لیا تھا مگر ٹی وی والے ان پر ڈاکو منٹری بنا رہے تھے۔ دو چار دن میرے گھر میں ٹی وی کی خوب رونقیں رہیں۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ وہ مجموعہ میرے منع کرنے کے بعد بھی ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب کو دے دیا جو مجھے بہت افسوس ہے کہ واپس نہیں ملا۔ عصمت آپا نے بڑی محنت سے اس میں ترمیم اور اضافات کئے تھے۔ کتابیں پڑھنے پر آتیں تو رات رات بھر پڑھتی رہتی تھیں اور اکثر گم صم کتابوں کے سحر میں کھوئی رہتی تھیں لیکن اس وقت لکھنا بالکل ختم ہو چکا تھا۔

گھر کے نوکروں سے بہت مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میری دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتے میں صاف نظر آتی ہے، اونچ نیچ، ذات پات، صرف ڈھونگ ہے۔ اصل چیز امیری اور غریبی ہے۔ اسی لئے وہ ہر ایک کو پوری آزادی دیتی۔ ایک صاحبہ جو پریس کے ایک ورکر کی والدہ تھیں، بڑی منہ پھٹ، آزاد خیال اور شرارتی قسم کی بڑھیا تھیں، نصیبن کی اماں کہی جاتی تھیں، ان کی عصمت آپا سے بہت عمدہ دوستی تھی۔ ایک دن میں کالج سے آئی تو

صباح الدین عمر، رام لعل، عمیق حنفی، عائشہ صدیقی، جیلانی بانو، اور رضوان علوی

دیکھا، ان کے ساتھ برابر کی کرسی پر بیٹھ کر ان کے ساتھ سگریٹ پی رہی تھیں۔ نصیبن کی اماں کو الگ بلا کر میں نے بہت احتیاط سے سمجھایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ یہ کون ہیں، بہت بڑی چیز ہیں، بہت قابل! ساری دنیا میں ان کی دھوم ہے۔ تم ان کے ساتھ سگریٹ پی رہی ہو۔ ابھی تمہارا لڑکا دیکھے تو کیا کہے گا؟! کہنے لگیں، 'کیا کہے گا؟ خود بھی تو پیتا ہے، ہم نے پیا تو کون بڑی بات ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں، اس لئے آپ کو برا لگ رہا ہے۔ آپ سوچ لیجئے کہ ہم بھی قابل آدمی ہیں، ہماری بھی بڑی دھوم ہے تو برا نہیں لگے گا۔' میں نصیبن کی اماں کا منھ دیکھنے لگی۔

دوسرے دن چٹنی کے لئے کیریاں چھیلتے ہوئے عصمت آپا نے مجھے سمجھایا تھا کہ ان لوگوں کے پاس زندگی کا اصلی تجربہ اور تصویر ہوتی ہے۔ انہیں کبھی معمولی مت سمجھنا بلکہ ان کو اپنے برابر بٹھا کر عام تفریق کی نفی کرتے ہوئے دنیا کی باتیں کرو پھر دیکھو کیا باتیں پتہ چلتی ہیں۔ اس عورت کے پاس دنیا اور نظام سے اتنی شکایتیں اور بغاوتیں ہیں کہ بیچاری بوجھ سے نڈھال ہے۔ ان کی زبان میں وہ کہانیاں ہیں جو کتابوں میں نہیں۔ وہ اپنے ساتھ سب کو چائے پلواتیں، سب کو کولڈ ڈرنک پلواتیں۔ مجھے ان کی یہ بات بہت پسند تھی۔

اس کام کے لئے ایک عورت افسرن تھی جو ان کا سب کام کرتی تھی۔ پیر دباتی تھی، خاصی بے تکلف تھی، وہ عصمت آپا سے اپنے میاں کی بہت تعریف کرتی تھی جب کہ میں نے ان کو بتایا تھا کہ بالکل نکھٹو ہے، کوئی کام نہیں کرتا ہے۔ یہ بلا وجہ فدا رہتی ہے۔ عصمت آپا نے مجھ سے بہت سادگی سے کہا تھا، 'مگر زندگی کو برتنا افسرن زیادہ بہتر جانتی ہے۔'

> عصمت چغتائی کہتی تھیں کہ وہ عورتوں کی وکیل نہیں، بھئی جس پر زیادتی ہوگی، اس کی مدد میرا فرض ہے۔

رام لعل صاحب نے ہندی اور اردو کے بہت سے ادیبوں کو ایک شام اپنے گھر پر بلایا تھا۔ عصمت آپا کے اعزاز میں نشست تھی۔ ان کے گھر اور ہمارے گھر سے کافی فاصلہ ہے۔ ایک گھنٹہ راستے میں صرف ہوتا۔ اس دن عصمت آپا سے ملنے گھر پر بہت لوگ آئے۔ حسب عادت باتوں میں مصروف تھیں۔

> عشق میں روتی بسورتی، ہجر کے گیت گاتی، ٹسوے بہاتی عورتیں، عورت ذات کے نام پر دھبہ لگتی ہیں۔ عشق اور لگن تو ایک طاقت ہے، اسے کمزوری بنانے والی عورتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

ہندی اور اردو رسم الخط پر بات ہو رہی تھی کیمرہ اور وائس رکارڈ چل رہے تھے۔ میں انہیں اکیلا چھوڑ نہیں رہی تھی کہ پتہ نہیں کیا بیان دے دیں حالانکہ انہیں اس وقت کسی کی بھی پرواہ نہ تھی۔ رام لعل صاحب کے تقاضوں پر انور بار بار ان کو بیچ میں ٹوکتے، 'رام لعل صاحب کا فون آیا'، 'رام لعل صاحب کے گھر جانا ہے۔' وہ کسی کی سن نہیں رہی تھیں۔ ایک بار انور نے درمیان میں سب کو روک کر عصمت آپا سے کہا 'رام لعل صاحب کا پھر پیغام آیا ہے۔'

'پیغام، کیسا پیغام، کیا شادی کا ارادہ ہے؟' عصمت آپا کا جواب تھا۔ رام لعل صاحب نے سنا تو وہ بھی بہت محظوظ ہوئے تھے۔

وقت تحریر عصمت چغتائی اپنے مخصوص انداز میں

ایک دوپہر ضد کر کے رام لعل صاحب کے گھر پہنچیں۔ بھری دوپہر، رام لعل آرام دہ لباس میں فرصت سے بہت سے پرانے خطوط کی فائلیں بکھرائے بیٹھے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر تھوڑا پریشان ہوئے۔ ان سے سوال ہوا، کیا کر رہے ہو؟

رام لعل صاحب نے تخت کی طرف اشارہ کیا، یہ ان لوگوں کے خطوط ہیں جو ابھی زندہ ہیں۔ اس طرف ان کے ہیں جو اب دنیا میں نہیں ہیں۔ کرسی پر ان کے خطوط ہیں جو تقسیم سے پہلے انتقال کر گئے۔

رام لعل کو تھوڑی دیر گھورتی رہیں پھر زور سے بولیں، 'کیا دماغ خراب ہو گیا ہے، زندگی اتنی لمبی نہیں ہے، ہم ہر روز ختم ہو رہے ہیں، کون یاد کرے گا ہمیں؟' اور تمام خطوط ہر جگہ سے سمیٹے اور ملا دئے۔

'کس کو فرصت ہے، کیا ضرورت ہے یاد کرنے اور یاد کروانے کی، پلٹ کر کوئی نہیں دیکھے گا،

تمہارا کام لکھنا ہے، لکھتے رہو۔ یہ مت سوچو کہ کوئی یاد کرے گا۔'

رام لعل بیچارے ہکا بکا ہمیں دیکھ رہے تھے، ان کی دن بھر کی محنت اکارت گئی تھی۔ ذرا دیر بعد وہیں تخت پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھ گئیں۔ پکوڑے کھاتے اور چائے پیتے وقت رام لعل حسرت سے کرسیوں پر فرش پر بکھرے پوسٹ کارڈ اور لینڈ لیٹرس دیکھ رہے تھے اور پتہ نہیں کیا سوچ رہے تھے۔

پریم چند صدی کے موقع پر اردو اکادمی اتر پردیش کے زیر اہتمام اردو افسانے پر سہ روزہ سیمینار میں عصمت چغتائی، شبیہ الحسن نونہروی، عابد سہیل، پروفیسر عقیل رضوی، بیگم انیس نصرت، پروفیسر شمیم نکہت ڈاکٹر صبیحہ انور کا افسانہ سنتے ہوئے

اپنے بمبئی کے ساتھیوں کا ذکر بہت محبت سے کرتی تھیں۔ سردار جعفری، سلطانہ جعفری، عباس صاحب وغیرہ کو اکثر یاد کرتی تھیں۔ یہاں ان کی تلاش میں جعفری صاحب نے کئی خط لکھے کہ واپس آؤ ورنہ تلاش گمشدہ میں تمہاری تصویر چھپوا دوں گا اور واپسی پر لکھنؤ سے میرے لئے قوام، زردہ اور صبیحہ سے بٹوہ ضرور لانا۔

دلیپ کمار بھی ان کے قریبی دوستوں میں تھے۔ ان کو یوسف کہتیں اور بڑی محبت سے دلیپ کمار کی سادگی کا ذکر کرتیں۔ خاص کر کامنی کوشل سے ان کے عشق کے زمانہ کی روداد بڑے دلچسپ طریقہ سے سناتیں کہ کس طرح دلیپ کمار اور یونٹ کے لوگ کامنی کوشل کے ہونے والے شوہر 'سود' کو جو پستول لگا کر ساتھ اسٹوڈیو آتے تھے، بیوقوف بنا کر دلیپ کمار سے ملواتے تھے اور دلیپ کمار کا روز کا معمول تھا کہ اسٹوڈیو کی ایک ٹین کی کرسی گھسیٹ کر روٹھ کر بیٹھ جاتے کہ اگر کامنی کوشل آج نہ آئی تو وہ کام نہیں کریں گے۔ یہی دلیپ کمار آگے چل کر مدھو بالا کے دیوانے ہو گئے تھے۔

باتوں ہی باتوں میں ایک بار امرتا پریتم کا ذکر

صبیحہ انور کی رہائش گاہ پر عصمت آپا، جیلانی بانو، صبیحہ انور، شکنتلا چھابڑہ (بیگم رام لعل) اور رضوان علوی

آیا۔ کہنے لگیں، بہت اچھی رائٹر ہے۔ بہت اچھی آرٹسٹ، مگر عشق کا ایسا بھوت سوار ہے کہ اگر ایک اترتا ہے تو دوسرے کا بھوت سوار۔ مجھے ایسی عورتیں پسند نہیں ہیں۔ عشق میں روتی بسورتی، ہجر کے گیت گاتی، ٹسوے بہاتی عورتیں، عورت ذات کے نام پر دھبہ لگتی ہیں۔ عشق اور لگن تو ایک طاقت ہے، اسے کمزوری بنانے والی عورتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔

عصمت آپا کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو یاد کروں تو وقت اتنا سہانا اور دلچسپ لگتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ ان یادوں کو دہراتی ہی رہوں۔ لکھنؤ کی ان ادبی محفلوں کو دہراؤں جہاں عصمت آپا کے ساتھ، گھنٹوں بیٹھی اور وہ محفل کو زعفران زار بنائے رہی تھیں۔

ان بے شمار لوگوں کا ذکر کروں جو روز ان سے ملنے آتے تھے اور وہ بہت محبت اور بے تکلفی سے ان سے بات کرتی تھیں اور دوبارہ آنے کے وعدے لیتی تھیں۔

آخری بار جب وہ آئی تھیں، تقریباً دو ماہ رہی تھیں۔ اپریل اور مئی کے گرم دنوں میں وہ ہمارے ساتھ تھیں۔ میرے بچوں کے ساتھ ان کا گزرا ہوا وقت یادگار وقت تھا۔ ان سب کو دہرانا میرے لئے ناممکن ہے۔ اگر واقعات کو بیان کیا بھی جائے تو ان کیفیات کو دوبارہ محسوس کرنا صرف میرے دل کو راحت دے سکتا ہے، میں اس کو بیان نہیں کر سکتی۔

● ڈاکٹر صبیحہ انور

عصمت چغتائی کے خطوط ڈاکٹر صبیحہ انور کے نام

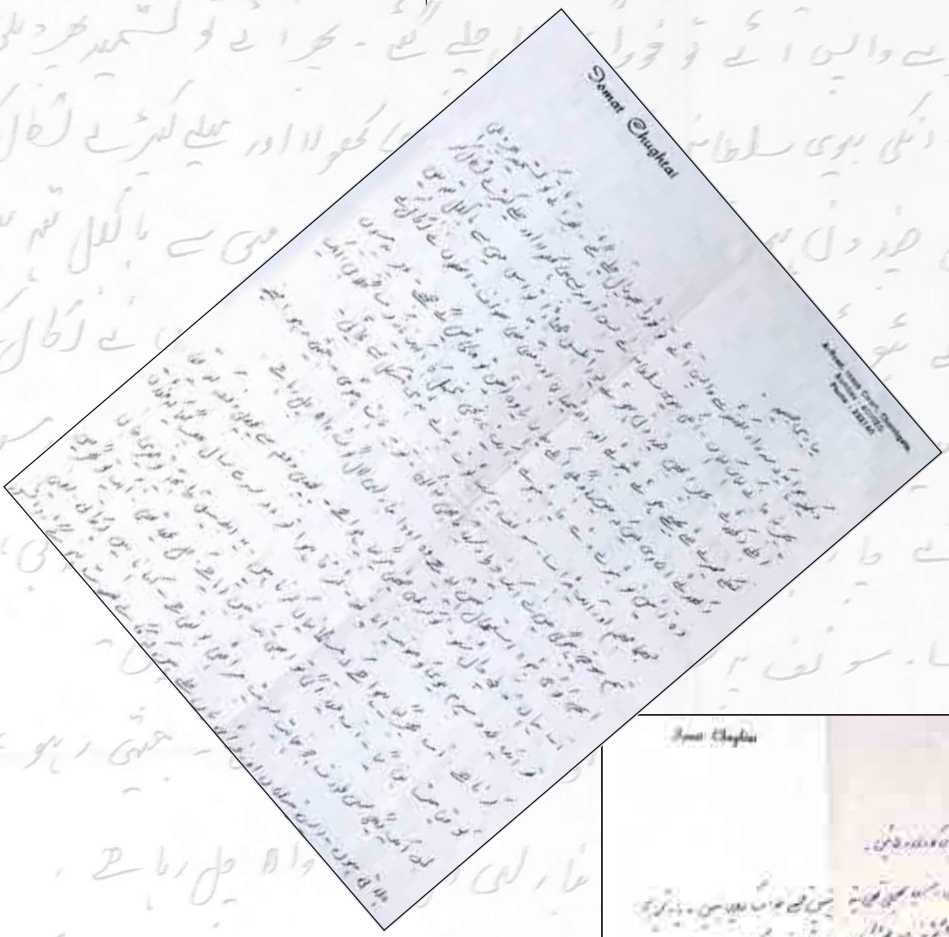

ادارۂ 'نیادور' کے اصرار پر ڈاکٹر صبیحہ انور نے عصمت چغتائی کے ان خطوط کو شائع کرنے کی اجازت دی

عصمت کے فکشن میں مماثل عناصر

سلمان عبدالصمد
روم نمبر 29 ماہی ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی
موبائل: 9810318692

اردو فکشن کو وقار و اعتبار عطا کرنے والی عصمت چغتائی کے فکشن کے مطالعہ سے ایک حقیقت یہ بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں تکرار کی کیفیت کچھ زیادہ ہے۔ نہ ان کے ناول اس سے پاک ہیں اور نہ ہی ان کی کہانیاں۔ ان کے سرمایۂ ادب میں نفسیاتی پیچیدگیوں اور محرومیوں کا جو گہرا عکس ابھرتا ہے، اس کی ابتدائی کڑیاں چغتائی کے پہلے افسانہ ''گیندا'' بعض لوگوں نے اس افسانہ کو اشاعت کے لحاظ سے ان کا تیسرا افسانہ قرار دیا ہے[سے مل جاتی ہیں۔ نفسیاتی رویوں اور انسانی ذات کی درون بینی سے متعلق معاملات کی تلاش کے تناظر میں یہ کہانی قابل اعتنا ہے۔ کیوں کہ اسی کا گہرا اثر ان کے فکشن کے لمبے سفر میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عصمت نے اس میں جو فکری جھلک دکھائی ہے، وہی دراصل ان کے سرمایہ فکشن کا غالب حصہ ہے، تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہونی چاہئے۔ عصمت کا یہ حقیقی قول اپنی جگہ مسلّم کہ انھوں نے لکھنے کے لیے کتابِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ تاہم یہ کہنے کی بھی گنجائش ہے کہ کتابِ زندگی کے مختلف اسباق کا اثر اُن پر کم، سبقِ 'مماثل نفسیاتی عناصر' کا رنگ کچھ زیادہ ہی چڑھا۔ یہ عیب ہے یا خوبی، ارباب دانش وبینش کے پاس اس فیصلہ کا اختیار ہے۔

یہ بات غالب طور پر عصمت کے سرمایہ کے متعلق کہی جاتی ہے کہ ان کا موضوع متوسط مسلم گھرانے کی لڑکیوں کے جنسی مسائل اور ان کے دیگر احوال وکوائف پر مبنی ہے۔ اس تناظر میں ان کی تحلیل نفسی سے ان کے گھریلو مسائل کا اثر دِکھتا ہے اور اس زمانہ کے حالات اور منظر نامہ کی عکاسی بخوبی ہونے لگتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں میں مسلم گھرانے کا عکس گہرا ہے اور 'گیندا' کے پس منظر کی یکساں نفسیاتی درون بینی بھی اپنی شمولیت کا احساس دلاتی ہے۔

''کون تھا، جو مجھ سے ہمدردی کرتا؟ بھیا نے تو کبھی منہ نہ لگایا۔ اماں نے کبھی لاڈ ہی نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدی ہوگئی۔ طبیعت میں جو الجھن پیدا ہوا سب سے بَیر باندھ لیا''۔(1)

یہ بات غالب طور پر عصمت کے سرمایہ کے متعلق کہی جاتی ہے کہ ان کا موضوع متوسط مسلم گھرانے کی لڑکیوں کے جنسی مسائل اور ان کے دیگر احوال وکوائف پر مبنی ہے۔ اس تناظر میں ان کی تحلیل نفسی سے ان کے گھریلو مسائل کا اثر دِکھتا ہے اور اس زمانہ کے حالات اور منظر نامہ کی عکاسی بخوبی ہونے لگتی ہے۔ ان کی بیشتر کہانیوں اور ناولوں میں مسلم گھرانے کا عکس گہرا ہے اور 'گیندا' کے پس منظر کی یکساں نفسیاتی درون بینی بھی اپنی شمولیت کا احساس دلاتی ہے۔ ''کون تھا، جو مجھ سے ہمدردی کرتا؟ بھیا نے تو کبھی منہ نہ لگایا، اماں نے کبھی لاڈ ہی نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بلا کی ضدی ہوگئی۔ طبیعت میں جو الجھن پیدا ہوا سب سے بَیر باندھ لیا''

گیندا کے یہ جملے عصمت کے شاہکار ناول 'ٹیڑھی لکیر' کے جملوں میں اس طرح رچ بس گئے، جنہیں الگ کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔ ان جملوں کو 'ضدی' کی چھلنی میں چھاننے سے بھی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ 'عجب آدمی' میں بھی ایسی ہی عجیب کرشمہ سازی ہے۔ کرداروں کی احساس محرومی نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔

محرومی (Deprition) انسانی تحت الشعور میں اس طرح پیوست ہوتی ہے کہ جہاں بھی کہیں محبت والفت کا احساس ہو، محروم فرد اس کی طرف از خود بڑھنے لگتا ہے۔ ایک انوکھی انجانی کشش پیدا ہوجاتی، جیسا کہ گیندا اور ٹیڑھی لکیر میں میں مختلف مقامات پر اس کا احساس ہوتا ہے۔ ٹیڑھی لکیر کی پہلی منزل کی پہلی سطر:

''وہ پیدا ہی بے موقع ہوئی۔ بڑی آپا کی چہیتی سہیلی سلمہ کی شادی تھی اور وہ بیٹھی جھپا جھپ سروئی کریپ کے دوپٹہ ٹانک رہی تھی۔۔۔۔۔۔ نو بچوں کے بعد ایک کا اضافہ' جیسے گھڑی کی سوئی آگے بڑھ گئی۔۔۔۔ خدا غارت کرے اس منی سی بہن کو۔ اماں کی کوکھ کیوں نہیں بند ہوجاتی''۔

(ٹیڑھی لکیر)

ان جملوں سے مماثلت کا سبق/ اثر بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ بچے کی پیدائش سے اہل خانہ کی پوری کشمکش اور ناگواری کی ساری کیفیتیں عیاں ہوجاتی ہیں۔ گیندا کی ''میں/ بہن'' اور ''ٹیڑھی لکیر کی شمن'' کی ساری مصیبتیں اور نارسائیاں واشگاف ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے اس ماحول میں پیدا ہونے والی لڑکیوں کے حصہ میں فقط محرومی ہی آئے گی۔

''ماں کی شفقت سے محرومی Oral Deprivation کہلاتا ہے۔ ایام طفولیت میں ماں کی شفقت اور نگہداشت سے محروم ہوجانے کی وجہ سے ذہنی تکلیف کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔''(2)

ساتھ ہی ساتھ گیندا اور ٹیڑھی لکیر کی یہ مماثلت بھی قابل توجہ بن جاتی کہ دونوں کردار (میں/شمن) چھوٹی عمر میں ہی بڑی عمر کی عورتوں کی جھلک دکھاتی ہیں۔ گیندا میں 'کردار مَیں' یعنی بہن کا یکا یک بڑا ہونا اور بھائی سے لمبی زبان میں گفتگو کرنا؛ بہن کی بیٹی کے تناظر میں (ابتدائی سطروں میں) ٹیڑھی شمن کا بڑی عورتوں کی طرح سوچنا بھی پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے اور دونوں جگہ پائی جانے والی مماثلتیں بھی کھل جاتی ہیں۔ بچی کرداروں اور ننھے دلوں میں عصمت تخیل کا اتنا گہرا رنگ بھرتی ہیں کہ 'تصنع کا پوٹریٹ' کھڑا ہو جاتا ہے۔

''آن کی آن میں کھیل بگڑ گیا۔ میں بھیا سے الجھ پڑی اور کرتی بھی کیا۔ ''ایں.... ں....جاؤ یہاں سے''۔ (گیندا)

بالکل یہی کیفیت ٹیڑھی لکیر میں بھی پائی جاتی ہے کہ اتّی سی شمن لمبے دماغ کا استعمال کرنے لگتی۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ عصمت کی بلند پرواز تخیل کی وہ تاب نہیں لا پاتی ہے۔ اس کے علاوہ دونوں (گیندا، ٹیڑھی لکیر) میں بچوں کی رقابت کی آگ بھی اتنی شدید نظر آتی کہ حیرت کا احساس ہوتا ہے۔ 'کئو دان' کی مس مالتی اور گوبندی دیوی (مسز کھنا) کے درمیان رقابت جتنی شدید ہوتی ہے، اس سے بھی کہیں زیادہ شمن اور گیندا کے معاملے کی لو تیز نظر آتی ہے۔ مالتی اور گوبندی کی رقابت جہاں قارئین کے ذہن میں ہلچل پیدا کر کے فنی گرفت مضبوط کرتی ہے، وہیں گیندا اور شمن کے معاملہ میں ڈھلمل رویہ اور تصنع کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑی عمر عورتوں اور بچیوں کے نفسیاتی رویوں یا ان کے احساسات و جذبات میں کوئی تفاوت ہی نہیں۔ اس طرح ان نفسیاتی کشمکش اور سبق کے مماثل اثرات سے عصمت کے سرمایوں پر 'تکراری رنگ' اپنا قبضہ جمانے لگ جاتا ہے۔

عورتوں کے ان رویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اپنے ہم پلہ عورت کے تذکرہ سے خوش نہیں ہوتی، بلکہ وہ رقابت کی آگ میں جھلسنے لگتی ہے۔ رقابت کا یہی جذبہ 'سوتن' کے معاملے میں شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر ماں کے روپ میں کسی دوسری ماں کے پاس یہ تذکرہ ہو تو شاید وہ سوچتی ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی ماں ہو بھی کیوں۔ اگر کسی بیوی کا ذکر ہو تو، مخاطِب عورت کے اندر ہلچل مچ جاتی ہے کہ مجھ سے بہتر بیوی کوئی ہوگی بھی تو کیوں۔ یعنی ہم پلہ عورت میں یہ رقابت کا جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے۔ گیندا کی طرف جب بھائی کا رجحان ہوتا ہے تو خود اس کی بہن (مَیں) میں رقابت سر ابھارنے لگتی ہے۔ ٹیڑھی لکیر اور ضدی میں بھی کئی مقام پر ایسی کیفیت سامنے آتی ہے۔

عورتوں کے ان رویوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت اپنے ہم پلہ عورت کے تذکرہ سے خوش نہیں ہوتی، بلکہ وہ رقابت کی آگ میں جھلسنے لگتی ہے۔ رقابت کا یہی جذبہ 'سوتن' کے معاملے میں شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر ماں کے روپ میں کسی دوسری ماں کے پاس یہ تذکرہ ہو تو شاید وہ سوچتی ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی ماں ہو بھی کیوں۔ اگر کسی بیوی کا ذکر ہو تو، مخاطِب عورت کے اندر ہلچل مچ جاتی ہے کہ مجھ سے بہتر بیوی کوئی ہوگی بھی تو کیوں۔ یعنی ہم پلہ عورت میں یہ رقابت کا جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے۔ گیندا کی طرف جب بھائی کا رجحان ہوتا ہے تو خود اس کی بہن (مَیں) میں رقابت سر ابھارنے لگتی ہے۔

عصمت نے اپنی پہلی کہانی کو جس پہلو پر مرتکز رکھا ہے، وہ اُس زمانہ کے مسلم گھرانے کی گھیرا بندی اور طبقہ اشرافیہ کا اپنے نوکروں/نوکرانیوں کے تعلقات کو واضح کرتا ہے۔ پھر یہ رویہ فرائڈ کے نظریوں کے فروغ پر بھی مبنی ہے۔ گرچہ عصمت نے الگ راہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے نفسیاتی تناظر میں فرائیڈ کے نظریات سے برعکس دلیل پیش کی کہ انھوں نے جنسی خواہشات سے سرور کار نہیں رکھا، بلکہ فقط مسلم گھرانوں کی گھیرا بندی سے پیدا ہونے والے حالات کو ہی پیش کیا ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ عصمت نے مغربی افسانوی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جہاں اپنے ماحول اور اطراف و اکناف کے اثرات قبول کیے وہیں مغربی رویوں نے بھی انھیں متاثر کیا۔ عصمت کے یہاں طریقہ کار چاہے جو بھی ہو، تاہم فرائڈ کے نظریات سے مفر نہیں۔ اس طرح انھوں نے مطالعات و مشاہدات کو ضم کرنے کی ایک نئی روش قائم کی۔ عصمت چغتائی کے متعلق مجنوں گورکھپوری کے اقوال کو پروفیسر عبدالسلام نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

''نہ موضوع کے اعتبار سے وہ کسی کی خوشہ چیں کہی جا سکتی ہیں، نہ اسلوب کے اعتبار سے۔ دونوں ان کی اپنی ذہانت اور طباعی کی پیداوار ہیں اور باہم مل کر ایک پورا مزاج بن گیے ہیں''۔ (3)

کپڑے پریس کر کے گیندا جب کہانی کی راوی 'مَیں' کے بھائی کے روم میں لا کر گنتی ہے تو برابر میں چھپا ہوا بھائی اسے بستر پر چاروں کھانے چت کر دیتا ہے۔ بھائی جس کا پورے گھر پر رعب ہے، اسے گیندا تھپڑ بھی رسید کر دیتی ہے۔ لیکن بھائی اس کا برا مانے بغیر اس کے بدن سے کھیلتا ہے۔ اس واقعہ کا بہن پر گہرا اثر ہوتا ہے اور طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن و دماغ میں اٹھنے لگتے ہیں۔ بھائی کو دہلی بھیج دیا جاتا ہے اور گیندا کے یہاں بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ کہانی کی پوری صورتحال معاشرتی منظر نامہ کو پیش کرتی ہے اور فرائڈ کا فلسفہ اس شدت سے سامنے آتا کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں جنسی بھوک کی تسکین لازمی ہے۔ اگر ماحول حبس زدہ ہو اور پہریداری کی کیفیت مضبوط ہو تو نوکرانیوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے تک کی نوبت آجائے گی۔ یہاں پر طبقہ اشرافیہ کے چہرے پر چڑھا شرافت کا مکھوٹا بھی گردش کرتا نظر آتا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا کہ ایسی نفسیاتی کیفیت تو عصمت چغتائی کے سرمایہ فکشن میں بہت ہی واضح طور پر ملتی ہے۔ جس سے کہ تکرار کا بھی احساس ہونے لگتا ہے۔ تاہم جب دیگر ادبا کے یہاں پائے جانے والے نفسیاتی

الجھنوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا نفسیاتی عنصر بہت ہی عام ہے۔ اس کے باوجود بھی عصمت نے مختلف مقامات پر اسی طریقہ کو بروئے کار لایا۔ 'انگارے' میں شامل سجاد ظہیر کی کہانی ''دلاری'' بھی اسی کیفیت کا احساس دلاتی ہے۔ حبس زدہ ماحول میں پلنے والا طبقہ اشرافیہ کا فرد موقع ملتے ہی گھنونے کھیل میں مصروف ہوجاتا ہے۔ 'دلاری' اور 'گیندا' کا موازنہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ تھیم کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ کہانی کے کرداروں کی نوعیت میں بھی یکسانیت ہے۔ کیوں کہ دونوں میں مرد کردار طبقہ اشرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اور نسوانی کردار دبے کچلے طبقہ سے۔ ضدّی کا معاملہ بھی ان دونوں سے کچھ زیادہ برعکس نہیں ہے۔ البتہ بنّت کے رویوں میں تفریق ضرور پائی جاتی ہے۔ چند معاصر افسانوں سے گیندا کا تقابل کریں تو اندازہ ہوگا کہ آج بھی گیندا جیسی فضا میں کہانیاں سامنے آرہی ہیں۔ تاہم کچھ نہ کچھ رنگ بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شائستہ فاخری کا افسانہ ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' میں بھی ایسے نفسیاتی الجھن پیش کیے گیے۔ گھر میں چونکہ حبس کا ماحول ہوتا ہے، اس لیے جب مرکزی کردار تعلیمی ہاسٹل کی لائف میں آتی ہے تو اس کی ذہنیت سامنے آنے لگ جاتی ہے اور اس کے حرکات وسکنات سے جنسی بھوک کے معاملات اجاگر ہوتے ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ کہانی بھی گیندا کے قریب پہنچتی ہے۔ تاہم اس کہانی کا تھیم ذرا مختلف ہے۔ فاخری نے جنسی نفسیات کے تناظر میں ہم جنسی رویوں کو بھی اٹھانے کی کوشش کی۔ اس طرح 'اداس لمحوں کی خود کلامی' گیندا کے قریب سے گزرتی ہوئی 'ٹیڑھی لکیر' سے اپنی کڑیاں ملانے لگتی ہے۔ یہاں پر جنسی حوالوں سے اپنی شناخت رکھنے والے شموئیل احمد کی کہانی 'برف میں آگ' کو سامنے رکھا جاسکتا ہے۔ تاہم انھوں نے کہانی کی بنّت میں ایسی جدت طرازی کی کہ گیندا اور دلاری کے پس منظر میں ہونے کے باوجود بھی ان کی کہانی مکمل طور پر اپنا الگ وجود رکھتی ہے اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ جنسی نفسیات کی ایسی ہی کہانی موجودہ دور سے بالکل ہم آہنگ ہوسکتی ہے۔ جنسی آسودگی نہ ہونے کی صورت میں 'برف میں آگ' جیسی کہانی ہی آج موزوں ہے۔ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' کی فضا میں گھر کی محبوس فضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کردار ہاسٹل آنے کے بعد اپنا کرشمہ دکھاتی ہے۔ لیکن 'برف میں آگ' میں حبس اور بندش کی کوئی فضا نہیں ہے، لیکن مرکزی کردار کی بیوی سرد ہے۔ اس کا بدن، عورت کا سا نہیں ہے۔ اس لیے وہ (کردار) لطف اندوز نہیں ہو پاتا ہے۔ چونکہ جنسی بھوک مٹتی نہیں، لہذا وہ محبوبہ پالتا ہے۔ محبوبہ بھی ایسی کہ محبوب سے اس کی بیوی کی باتیں دل کھول کر کرتی ہے۔ بیوی کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتی ہے۔ اگر شموئیل احمد اپنی کہانی میں محبوبہ سے اپنی بیوی کا تذکرہ نہیں کرتے تو شاید یہ کہانی بھی روایتی ہوجاتی۔ ہوتا بھی ایسا ہی کہ ایک مرد اگر بیوی سے آسودہ نہیں ہوتا یا پھر عورت شوہر سے مطمئن نہیں تو چھپا چھپی کا کھیل شروع ہوجاتا ہے۔ عموماً نفسیاتی جنس کے پس میں ایسی کہانی ہی بیان کردی جاتی ہے۔ لیکن شموئیل احمد نے اس کہانی میں محبوبہ کے سہارے جدت کا رنگ کچھ اس طرح بھرا کہ مماثل جنسی مسائل پر مبنی کہانیوں میں بھی یہ کہانی اپنی انفرادیت درج کرواتی ہے۔ یاد رہے کہ محبوبہ کا معاملہ تو ضمنی حیثیت رکھتا ہے، اس کے باوجود بھی یہ پہلو کہانی میں نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ کہانی کا مکمل جنسی رویہ تو بیوی کے برف آشنا اعضا وجوارح میں سلگنے والی آگ سے منسلک ہے۔ گیندا کے تجزیے سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عصمت کے سرمایہ پر اس کہانی کا گہرا اثر ہے، وہیں یہ بھی صاف ہوجاتا ہے کہ مماثل نفسیاتی رنگ موجودہ عہد کے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ جنسی نفسیات اور انسانی پیچ وخم کے ماہرین بھی فقط لفظی الٹ پھیر کے سہارے نئی نئی کہانیاں بننے میں مصروف ہیں۔ رنگوں کا عکس نچوڑنے کی روایت آگے بڑھتی چلی جارہی ہے، جو کہ نفسیاتی کہانیوں کے نام پر دھبہ ہے۔ نفسیات، خصوصاً جنس کی نفسیات پر لکھنے والے ہمیشہ یہ سوچتے ہیں کہ ہم نے جنسیاتی پہلو لکھ کر کہانی کو منٹو سے آگے بڑھا دیا ہے۔ اگر اس ضمن میں کسی خاتون افسانہ نگار کی نفسیاتی کہانی کا تجزیہ ہو تو وہ تجزیہ نگار سے امید کرتی ہیں کہ ان کی کہانی، عصمت چغتائی سے بڑی کہانی تسلیم کی جائے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنس کی نفسیات پر لکھی گئی بیشتر کہانیوں میں مماثل عناصر پائے جاتے ہیں۔ دوسروں کی نفسیاتی کہانی سے الگ چراغ چلانے میں عصمت بھی کسی سے کم نہیں ہے تو مماثل رنگ کے ساتھ نئی لکھنے والی خواتین کہاں ان سے آگے بڑھ سکتی ہیں۔

جیسا کہ کہا گیا کہ ایسی نفسیاتی کیفیت تو عصمت چغتائی کے سرمایہ فکشن میں بہت ہی واضح طور پر ملتی ہے۔ جس سے کہ تکرار کا بھی احساس ہونے لگتا ہے۔ تاہم جب دیگر ادبا کے یہاں پائے جانے والے نفسیاتی الجھنوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کا نفسیاتی عنصر بہت ہی عام ہے۔ اس کے باوجود بھی عصمت نے مختلف مقامات پر اسی طریقہ کو بروئے کار لایا۔ 'انگارے' میں شامل سجاد ظہیر کی کہانی ''دلاری'' بھی اسی کیفیت کا احساس دلاتی ہے۔ حبس زدہ ماحول میں پلنے والا طبقہ اشرافیہ کا فرد موقع ملتے ہی گھنونے کھیل میں مصروف ہوجاتا ہے۔

حواشی:

(1) عصمت چغتائی کے افسانے (جلد اول)، کتابی دنیا دہلی 2006، ص 10۔

(2) الفریم روزن، ابنارمل نفسیات، (مترجم: ذکیہ مشہدی) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1985، ص 162)

(3) عبدالسلام، عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول، اعجاز پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج دہلی، ص 8

□□□

ٹیڑھی لکیر

اس کی قسمت سے جو چیز زندگی میں آتی تھی طوفان کی طرح آتی، یکا یک لوگوں کو اس کی تعلیم کا خیال آیا اور بس طاعون کی طرح سب کے دماغوں کو جکڑ لیا۔ سبھی تو اس کے پیچھے 'پڑھو' کا ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ بڑی آپا تو پڑھائی کم نوری سے مقابلہ کر کے ذلیل وحقیر زیادہ کرتیں۔ مولوی اور ماسٹر بھی آ کر اپنے دانت اس پر تیز کرتے۔

'پل پر جا۔' کیوں؟ وہ معلوم کرنا چاہتی تھی۔

'یہ اس کا دیور ہے۔' ہوا رے، شمن کو کیا، اس کا دیور تو نہیں۔ وہ جل جاتی۔ اسے کسی کے دیور سے کیا ناطہ جوڑنا تھا جو وہ یاد کرتی۔

'دس تک گن۔' اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا، ایک ہتھوڑی لے کر کھٹاک کھٹاک ماسٹر صاحب کی کھوپڑی پر سوتک گن دے اور پھر پانچ چھکے تیس۔ یہ لیجئے یہ کیوں؟ پانچ چھکے سولہ کیوں نہیں؟ پھر جوڑنا، گھٹانا، ضرب، تقسیم، کاش اسے معلوم ہوتا کہ وہ کس کی بوٹیاں بانٹ رہی ہے اور کس کا کون گھٹا رہی ہے تو شاید اس کو رحم آ جاتا اور وہ کچھ دلچسپی لینے لگتی۔ مگر دلچسپی نہ لینا ماسٹر صاحب کی موجودگی میں ممکن نہ تھا۔ عموماً وہ تو کسی کا سوال آنکھ ٹیڑھی کر کے نقل کر لیتی اور سب کے بعد میں جا کر اپنی سلیٹ دکھاتی مگر بعض وقت ماسٹر صاحب کچھ تاڑ جاتے اور اس کی ہی سلیٹ کے پیچھے پڑ جاتے، اس وقت بڑی مصیبت آتی اور وہ گھبرا کر ہتھیلیوں میں تھوک لے کر سلیٹ پر تھوپنے لگتی، ایسے موقعوں پر عموماً اس کا حلق سوکھ جاتا جس پر وہ جھلا کر پیٹ میں درد یا کوئی حاجت محسوس کرنے لگتی لیکن ماسٹر صاحب کے چانٹوں کا جادو مسیحائی کا کام کرتا اور دم بھر میں تکلیف چھومنتر ہو جاتی۔ ایک نوکر کے لڑکے کا نام لوا تھا جو دق کی طرح ہر وقت اپنی ماں کے کلیجے پر ماتم کیا کرتا تھا بس عبارتی سوال تو اس کی جان کو لوا بن کر چپک گئے تھے اور بے طرح اس کی روح کو جھنجھوڑ دیتے۔

'کم کا ضرب، زیادہ کی تقسیم'

مگر یہ اس کی سمجھ میں کبھی نہ آیا کہ کم اور زیادہ میں کتنا فرق ہے۔

'ایک پیسے کی دو نارنگیاں تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟'

اول تو سرے سے یہ گلچھرے ہی اس کی قسمت میں نہیں لکھے تھے کہ وہ ایک پیسے کی دو نارنگیاں خرید سکے۔ دوسرے زیادہ سے زیادہ دو پیسے کی نارنگیاں کافی ہوتیں، بھلا ڈیڑھ روپے کی کون گاڑی بھر نارنگیاں خریدے گا، سڑ نہیں جائیں گی، ساری کی ساری۔ پچھلی گرمیوں میں آگرہ والی خالہ نے دو ٹوکرے خربوزے بھیجے۔ سارے سڑ سڑ کر ہی تو پھکے مگر فوراً ہی اسے آگرہ والی خالہ کا چھدری داڑھی والا میاں یاد آ جاتا جس کی تیم کی مٹی کی اس نے اور نوری نے کلیاں بنا ڈالی تھیں اور شاید اسی دن سے اس نے خربوزے بیچنے بند کر دئے۔ اچھے ہوتے تھے پیچارے خربوزے، بیچ زمین پر لیس لیس کر چھلنیوں میں دھوئے جاتے تھے اور پھر.....

ترّ سے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھلستی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سلیٹ کی نوک جوتاک میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی تو اس کی ناک میں آ لگتی۔ 'سن! اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو کتنی نارنگیاں خریدے گی؟' اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی چونا نارنگیاں لیتی اور کیا سچ تو ہے، بھلا پیسہ کی دو نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی۔ ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے۔ خواہ مخواہ کھٹی نارنگیاں خریدوائے دیتے تھے۔ پیسہ ملتا تو کبھی سے فیصلہ کئے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پستے لگی گزک خریدے گی۔

ترّ سے ایک چانٹا پڑتا اور وہ خربوزے کے بیجوں پر سے پھلستی ہوئی جاگ پڑتی اور اس موقع پر سلیٹ کی نوک جوتاک میں نشانہ باندھے بیٹھی ہوتی تو اس کی ناک میں آ لگتی۔

'سن! اگر تجھے ایک پیسہ دیا جائے تو کتنی نارنگیاں خریدے گی؟' اگر خدا کی قدرت جوش مارتی اور واقعی اسے پیسہ دیا جاتا تو وہ بھلا پاگل ہوئی تھی جو کھٹی چونا نارنگیاں لیتی اور کیا سچ تو ہے، بھلا پیسہ کی دو نارنگیاں کھٹی نہ ہوں گی تو اور کیسی ہوں گی۔ ماسٹر صاحب تو سدا کے سڑی تھے۔ خواہ مخواہ کھٹی نارنگیاں خریدوائے دیتے تھے۔ پیسہ ملتا تو کبھی سے فیصلہ کئے بیٹھی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے کٹی ہوئی پستے لگی گزک خریدے گی اور چکھنے کے بہانے ایک ریوڑی بھی مانگ لے گی۔

'ارے بول! کتنی نارنگیاں آئیں گی؟'

'نارنگیاں .....آں' وہ ابھی فیصلہ بھی نہ کر چکتی کہ نارنگیاں لے ہی ڈالے یا گزک کے لئے پیسہ اٹھا رکھے کہ ماسٹر صاحب بے صبر ہو جاتے۔

'کوڑ مغز کہیں کی.....ارے ہاں نارنگیاں..... ایک پیسہ کی دو تو ڈیڑھ روپے کی کتنی؟'

'ڈیڑھ.....ڈیڑھ روپے کی!' ذرا سوچئے۔

'ہاں ڈیڑھ روپے کی، روپے کے آنے بنانے آتے ہیں؟'

ماسٹر صاحب کے سامنے 'نہیں' کہنے، سر ہلانے کی اجازت نہ تھی لہٰذا 'ہاں'

'تو پھر بتا۔'

اور وہ آنے بنانے شروع کرتی ..... کافی تو ہوں گے ڈیڑھ روپے کے آنے، خاصے ڈھیر سے اور کیا!.....عید پر کوئی گیارہ آنے ہو گئے تھے تو واسکٹ کی جیب لٹک گئی تھی۔ اماں نے نہ جانے کس کام کے لئے تین آنے قرض مانگے تھے تو اس کی جان نکل گئی تھی۔ اماں تھیں بھی چھٹی ہوئی نا دہند۔ جہاں کسی کے پاس چار پیسے دیکھے اور ان پر غریبی چھائی پھر واپس دینے کی نوبت کبھی نہ آتی۔ کون تھا جو تقاضا کر سکتا۔

'اری بول! ڈیڑھ روپے کے کتنے پیسے ہوئے؟

'ڈیڑھ روپے کے پیسے؟'

'ہاں کم بخت۔'

'سولہ' اٹھے ہوئے تھپڑ سے بچ کر کہہ دیتی۔

'سولہ، سولہ پیسے ہیں؟' اور ماسٹر صاحب پر بھوت سوار ہو جاتا جیسے سولہ پیسے دے کر کوئی انہیں ٹھگے لے رہا ہے۔ وہ جی بھر کر مار لینے کے بعد خود ہی پیسے بنا لیتے۔ 'چھیانوے، منحوس اچھا اب بتا تیرے پاس اتنے پیسے ہیں؟' وہ پیسے بنوائی کا چانٹا وصول کر لیتے۔

'ہاں۔'

'اب تو بازار جاتی ہے۔'

'ہاں' گو اسے یقین تھا کہ کوئی اسے بازار نہ جانے دے گا اور نہ ہی اتنی کٹائی کے بعد اتنی ہمت رہ جاتی۔ دوسرے یہ سب بہانے بنائے جا رہے ہیں اسے الو بنانے کے لئے مگر اسے فرض کرنا ہی پڑتا کیونکہ فضا میں چانٹا منڈلاتا نظر آتا۔

'اب تو وہاں ایک پیسہ کے دو کے حساب سے نارنگیاں خریدتی ہے۔'

'چہ! پھر وہی ترش نارنگیاں! 'خیر وہ مجبوراً خریدتی۔

'کتنی ہوئیں؟'

'ایں' وہ ایسی شکل بناتی گویا بس کوئی دم میں سوچ کر بتا ہی دے گی۔

'نارنگیاں۔'

'ارے بتا؟ کتنی ہوئیں تین نارنگیوں کے حساب سے؟' بولائے ماسٹر صاحب۔

'تین؟' وہ ہچکچا کر سوچتی۔ 'تین نارنگیاں، ہاں۔' وہ وثوق سے کہتی۔

'تین، ڈیڑھ روپے کی تین نارنگیاں۔'

'نہیں.....نہیں' وہ گڑگڑا کر ماسٹر صاحب کے وار کہنیوں پر روکتی۔

'تو پھر بتا.....بتا.....فوراً'

اسی طرح شام ہو جاتی۔ ماسٹر صاحب پسینہ میں ڈوب کر نڈھال ہو جاتے جیسے کسی نے گھن چکریاں باندھ کر گھما ڈالا ہو۔ ان کے اعضا بے قابو ہو کر الٹے سیدھے ہلنے لگتے۔ معلوم ہوتا اتنی دیر وہ بچوں میں پڑھا نہیں رہے تھے بلکہ اپنی نوشتہ تقدیر پڑھ رہے تھے۔ پست ہو کر وہ دوسرے دن نارنگیاں جبراً خریدوانے کا پختہ وعدہ کر کے چلے جاتے۔

جھیلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج..... جھیلم، چناب، راوی..... ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا جیسے تسبیح کے گول دانے، جھیلم، جھیلم کے بعد ..... چناب، گول دائرے میں ایک دوسرے کے کرتے کا پچھلا دامن پکڑے جیسے ہی ریل ریل کھیلتے ہیں۔ جھیلم پھر چناب پھر اس کے پیچھے راوی چلی جا رہی ہے پھر.....

'یاد ہو گیا؟' ماسٹر صاحب ایک دم حملہ آور ہوئے۔

'جی، جھیلم، پنجاب.....'

'جھیلم، چناب، را.....'

'نہیں مانے گا رے اچھو ..... اے کیا ہوئی تیری سلیٹ نکال، بستے میں کیا انڈے دے رہی ہے؟'

ماسٹر صاحب نہایت چابکدستی سے چومکھے چانٹے بانٹتے جاتے۔ کیا مجال جو کوئی کونا ڈھیلا پڑ جائے۔

'ہاں ہاں جھیلم کہاں سے نکلتا ہے ..... نکال پنسل.....ہاں.....ارے بول تو کیوں چپکی بیٹھی ہے؟'

'جھیلم.....ام' وہ بھولنے لگتی۔

'ارے آگے بھی تو بڑھ، ایک جگہ کیوں مر کے رہ گئی۔ ہاں بتا'

'چناب' قریب قریب بالکل بھول کر وہ ہانپتی۔

'ہاں، ہاں، کہاں سے نکلتا ہے؟ دیکھ رہا ہوں، منو، بدذات، ارے اں بتا' ایسا معلوم ہوتا ماسٹر صاحب مچھلی مچھلی کھیل رہے ہیں۔ ادھر ادھر وہ چاروں

> ان کمبخت دریاؤں سے تو ہزار گنا اچھا وہ نالہ تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ روپہلی سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا۔ اس کے کنارے بالکل مکھی کے برابر مینڈکیاں گھاس میں پھدکا کرتی تھیں اور جب کاغذ کی ناؤ میں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی۔ وہ تالیاں بجاتی، اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے چک پھیریاں دیتی تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔

طرف بھونک بھونک کر پڑھاتے اور کسی کو بھی نہ پڑھا پاتے۔

'بول مردار، کہاں بہتی ہے؟'

'جی زمین پر'

'ایں! زمین پر' ماسٹر صاحب برا مان جاتے۔ گویا دریا کو زمین پر گھسیٹ کر کسی نے ان کی ہی ہتک کر ڈالی۔ پر کچھ لاجواب سے ہو جاتے۔

'مگر یہ تو بتا، کہاں، کس جگہ سے نکلتا ہے؟ اور کون سے خطے کو سیراب کرتا ہے؟'

'جی، خطے؟'

'ارے ہاں، نہیں تو کیا، تیرے سر کو سیراب کرے گا'

'جی، سیراب.....تو.....' وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی۔

'ہاں، نہیں یاد.....اچھا اور اس کے ساتھ کون کون سے دریا بہتے ہیں.....اسی خطے میں'

'خطے میں تو..... دریا بہتے ہیں'

'نام بتا سب دریاؤں کے، چناب اور؟'

'جی، چناب؟'

'ارے بھئی ہاں، منحوس اور؟'

'اور..... ر.....ا.....م.....آں اور چناب'

وہ دماغ کو خوب بھینچ کر زور لگاتی۔

'پھر بھول گئی دریاؤں کے نام۔ ایں؟'

'جی، وہ جمنا، گوداوری، کرشنا' وہ جلدی جلدی بتاتی جاتی اور کہنی کی تکون بنا کر سر پر کھڑی کر لیتی مگر ماسٹر صاحب پر تو جنون سوار ہو چکا ہوتا اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ کتنی کوڑھ مغز تھی وہ ماسٹر صاحب سچ کہتے ہیں، اس کے دماغ میں بھوسہ بھرا تھا۔ کاش اس کے جسم میں کوئی اس قسم کا مادہ ٹھنسا ہوتا جو مار سے ایسی ٹیسیں تو اٹھتیں، اس نے کتنے کتنے قلم کے خول میں سے نکلتے ہوئے لہریئے دار تنکے کھائے، بدمزہ اور پھیکے مگر دماغ ویسا ہی کند رہا اور ماسٹر صاحب تو کہہ چکے تھے کہ وہ بالکل نہیں پڑھ سکتی۔ بھیجا ہے ہی نہیں سر میں اور یہ تو وہی چناب تھا، جھیلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج والا چناب، خدا غارت کرے اسے..... یاد ہی نہ آیا۔ پھر اس کے دماغ میں گول گول تسبیح کے دانوں کی طرح جھیلم، پنجاب، راوی چکروں میں رقص کرنے لگتے۔ مگر ماسٹر صاحب تو کہتے ہیں کہ دریا بہتے ہیں۔ اچھا تو دریا بہت ہیں مگر یہ کمبخت کہاں الٹے سیدھے بہا کرتے ہیں۔ کاش وہ گھر کے پاس آ کر ہی بہے ہوتے تو یوں اس کی زندگی میں کٹھن بندھن نہ بندھ جاتے۔

ان کمبخت دریاؤں سے تو ہزار گنا اچھا وہ نالہ تھا جو کھیت کے بیچوں بیچ رو پہلی سانپ کی طرح لہرایا کرتا تھا۔ اس کے کنارے بالکل مکھی کے برابر مینڈکیاں گھاس میں پھدکا کرتی تھیں اور جب کاغذ کی ناؤ میں وہ ان ننھے مینڈکوں کو مسافر بنا کر نالے کے دھارے پر چھوڑ دیتی تو کشتی کس شان سے سینہ تانے بہتی چلی جاتی۔ وہ تالیاں بجاتی، اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی اور جب کوئی تنکا یا لکڑی ناؤ میں پھنس کر اسے چک پھیریاں دیتی تو اس کے جوڑ کھل جاتے اور ننھے مینڈک بہادر تیراکوں کی طرح پانی میں چھلانگ مار کر کنارے پر آن لگتے۔ اس نالے میں کبھی کبھی کہیں سے مچھلیاں بھی بہہ آتیں، تب تو کنارے پر سینکڑوں جانور دعوت اڑانے آ نکلتے۔ بڑا مزا آتا۔

مگر جھیلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج، انہیں بھی تو یاد کرنا تھا۔

نوری تھی تو بڑی آپا کی لڑکی، سانپ کا بچہ سنپولیا، شمن نے اس سے دوستی بڑے سوچ بچار کے بعد کی تھی کیونکہ گھر میں وہ تھی یا نوری۔ باقی سارے لڑکے جن سے ان کی ایک منٹ بھی نہ نبھتی۔ اس لئے نہیں کہ وہ لوگ اسے مارتے تھے مارنے میں وہ خود کچھ کم نہ تھی۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ وہ موقع بے موقع اس کی گڑیاں بھی چیر ڈالا کرتے تھے اور نوری کے پاس تو گڑیاں بھی تھیں جن کی وہ دونوں مل کر روز شادیاں کرتی تھیں۔ گھنٹوں اسباب کے کمرے میں کھڑی پر چڑھی سبز جوڑے گودڑ سے کھیلا کرتیں۔ جی گھبرا جاتا تو گلی میں کھیلتے لڑکوں کو دیکھا کرتیں۔ گلی کیا تھی، تھیٹر کی اسٹیج تھی، وہ گئی چندھی بڑھائی کی نوجوان بہو کھڑکی میں سے صدیق نے پکار لگائی ..... دولڑکے ایک دوسرے کو نوچتے کھسوٹتے گالیاں دیتے گزر گئے..... بیر لو بیر، میٹھے بیر..... گردے کلیجی .....بیل، صابن، موتی اور پھر چھجے پر بیٹھی سگھڑ بندریاں جو اپنے بچوں کی جوئیں بین بین کر کھایا کرتی تھیں۔ پرانی مسجد کے ملا جی جن کے آتے ہی دونوں کھڑکی کے نیچے دبک جاتیں، دل دھڑکنے لگتے اور ناکوں پر پسینے آ جاتے مگر پھر ان کے دلوں میں کھد بد ہوتی، رہ رہ کر جھانکنے کو جی چاہتا۔ وہ ڈری ہوئی چوہیوں کی طرح آہستہ سے اوپر ابھرتیں، ملا جی دیوار سے ناک لگائے گھنٹوں کھڑے عجیب بھیانک حرکتیں کیا کرتے۔ پہلے دن جب وہ بالکل بے خبر غور سے دیکھ رہی تھیں تو وہ ان سے نہ جانے کیا کہنے لگے، پہلے تو ان کو سنائی نہ دیا کہ وہ کیا اشد ضروری بات کہنا چاہتے ہیں۔ مگر جب وہ ذرا آگے جھکیں تو مارے خوف کے وہ وہیں جم کر رہ گئیں جیسے اژدہے کو دیکھ کر بندر مسحور ہو جاتے ہیں، اسی طرح سانسیں رکے، مٹھیوں سے جنگلہ پکڑے وہ لٹکی گھورا کیں، پھر نہ جانے کیسے وہ ایک برقی طاقت سے جھٹکا کھا کر زخمی چڑیوں کی طرح پیچھے گریں اور اٹھ کر ایسی بے تحاشا بھاگیں جیسے ملا جی چھلانگ مار کر جنگلے میں سے گردنیں پکڑ ہی تو لیتے۔ بڑی دیر تک ان کے حواس غائب رہے، حلق اور ہاتھ پیر بے قابو۔

پانی پی کر ذرا دم میں دم آیا تو ڈرتے ڈرتے انہیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتی ہیں۔

'کہو بھئی! مزاج تو اچھے ہیں؟'

اس کے بعد تو ایک دم سے کھوکھلے قہقہے لگا کر بیدم ہونے لگیں اور کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسی دباتی رہیں۔ گویا ان کے سینوں میں بڑے ہی اہم راز دفن خاموش ادھم مچا رہے ہیں، انہوں نے آپس میں کوئی تبادلہ خیالات نہ کیا جیسے وہ بڑی جہاندیدہ ہیں۔ حالانکہ ان کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے اور ایسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ بات بھول بھول جاتی تھیں۔

کھانے کے وقت شمن کا جی متلانے لگا۔ بار بار بھیانک زخم کے غار کی طرح اس کے ذہن میں کوئی چیز پھیلنے لگتی۔ اگر وہ گاڑی کے پہیوں میں کسی انسان کو پستا ہوا دیکھتی، تب بھی ایسی دہشت اس کے جی پر نہ بیٹھتی۔ اس کے تمام احساسات پر جیسے کسی نے اونچائی سے بھاری پتھر پٹخ دیا ہو جس کے نیچے وہ زخمی کیڑوں کی طرح دبی ہوئی تلملا رہی تھی۔

کئی دن تک وہ اس دلچسپ کھڑکی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں جیسے وہاں کوئی قتل کر کے بھاگ آئیں تھیں اور لاش اب بھی پڑی سڑ رہی تھی۔ پھر دور ہی دور سے وہ معنی خیز نظریں ڈالتی گزر جاتیں، ان کا تخیل کھڑکی سے باہر کود جاتا اور پھر وہاں سے دہشت زدہ ہو کر بھاگتا مگر رفتہ رفتہ ان کی ہیبت کم ہوگئی اور وہ صرف ان اوقات میں بھاگ آتیں جب ظہر کی نماز سے لوگ فارغ ہو جاتے اور گلی قبرستان کی طرح سنسان ہو جاتی پھر تو وہ اور دلیر ہوتی گئیں اور اب یہ حال تھا کہ جان بوجھ کر ملا جی کو آتے دیکھ کر دبک جاتیں اور پھر اچک اچک کر جھانکا کرتیں۔ ہر بار ان کے جی متلاتے، سوکھی سوکھی قے کے جھٹکے لگتے اور طبیعتیں مکدر ہو جاتیں، مجروح دماغ ہل ہل جاتے۔

نوری کی گڑیا، شمن کا گڈا بلا ناغہ بیاہے جاتے اور وہی پرانے جوتے کے ڈبے کی پالکی میں دلہن بٹھائی جاتی۔ مویوں کے آنگن سے آراستہ ہاتھ سے دلہن سب کو سلام کرتی اور مسہری پر سو جاتی پھر گڈا دونوں ٹانگوں پر کودتا ہوا آتا اور کرسی پر کھڑا ہو جاتا..... کھیل ختم!

'پڑوس میں صدیقہ کی خالہ کی شادی ہوئی تو علاوہ منڈیر سے گہما گہمی دیکھنے کے انہوں نے بہت سی رسمیں سیکھ لیں، دلہن کی گود میں آئینہ رکھا گیا اور دولہا نے اس کا منہ دیکھا۔

'بیوی میں تیرا غلام ..... منہ کھولو' کھسیانے دولہا کو کہنا پڑا تھا اور پھر کھیر چٹائی گئی، دولہا نے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے مہندی لگے شرمائے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے جیسے کسی نے ان کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں۔ دولہا دلہن کی ہر پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چمک چمک کر قہقہے لگاتی تھیں۔ شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور نوری تو بضد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھری میں دولہا دلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھیں۔ گویا وہ کوئی میٹھا سا لڈو تھا جسے چکھ چکھ کر چٹخارے بھر رہی تھیں۔ پھر رات کو خوب دولہا کو کھسیانا کیا گیا جس میں چند نوجوان شوقین بیویاں حصہ لے رہی تھیں اور کنواری لڑکیوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر بھگایا جا رہا تھا۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے۔ دروازوں کی درزوں اور روشن دان پر بیویاں مکھیوں کی طرح چپکی پڑی تھیں جب کہ ان کے خاوند اور بچے گھروں میں پڑے واویلا مچا رہے تھے۔

'بیوی میں تیرا غلام .....منہ کھولو' کھسیانے دولہا کو کہنا پڑا تھا اور پھر کھیر چٹائی گئی، دولہا نے کیا ہنس ہنس کے دلہن کے مہندی لگے شرمائے ہاتھ پر سے کھیر چاٹ لی تھی کہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے جیسے کسی نے ان کی بغلوں میں گدگدیاں کر دی ہوں۔ دولہا دلہن کی ہر پیاری سی لگاوٹ والی رسم پر بیویاں چمک چمک کر قہقہے لگاتی تھیں۔ شمن کو بھی ارمان بھری گدگدی محسوس ہوتی تھی اور نوری تو بضد تھی کہ چلو اندھیری کوٹھری میں دولہا دلہن کھیلیں۔ یہی نہیں بلکہ شادی کے بعد عورتیں دولہا کو چھیڑ چھیڑ کر مزے لے رہی تھیں۔

گڈے گڑیا کی شادی اب کی دفعہ اور دھوم سے ہوئی۔ نکاح کے چھوہاروں کے بجائے مرمرہ اچھالے گئے اور دلہن کی ہتھیلی پر سے دولہا نے کھیر چاٹی۔ نوری اندھی نے ساری گڑیا کی کا دوپٹہ کھیر میں لتھیڑ دیا اس لئے شمن نے اٹھا کر بہو کو دہلیز پر پٹخ دیا جس پر نوری اور وہ خوب گتھم گتھا ہوئیں اور ایک دوسرے کے بال بھر بھر بکٹے نوچ پھینکے۔

گڑیا ویسے بھی میلی ہوگئی تھی۔ گھوڑے کا سا منہ، اس لئے جب نئی گڑیا بڑی آپا نے بنا کر دی تو انہوں نے اس کی ناک ڈورے کیب جائے کپڑے کی بنوائی اور چٹیا بھی کالا موزہ ادھیڑ کر لگائی۔ لمبا سا منہ بنا ڈالا، پھر بھی انہیں اطمینان نہ ہوا تو ہاتھوں میں ڈورے کی انگلیاں لگوا لیں۔ پھر ایک دن بڑی ہمت کے بعد انہوں نے نہایت ہی پوشیدہ جگہ جا کر اس کی واسکٹ میں روئی کی دو گولیاں رکھ دیں، مگر اس سے انہیں اتنی شرم آئی کہ آنکھ بھر کر گڑیا کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔ مہین کریپ کا دوپٹہ اوڑھ کر کپڑے کی ناک اور ڈورے کی انگلیوں والی گڑیا بالکل جیتی جاگتی عورت لگنے لگی۔ توبہ! ان کا دل کسی کام میں نہ لگا اور وہ تمام دن اس کا بیاہ کرتی رہیں لیکن ایک دن جو گودڑ کی تلاش میں بڑی آپا نے گڑیوں کا جائزہ لیا تو ان کی چوری پکڑی گئی۔ اس کی اور نوری کی وہ گت بنائی گئی کہ دونوں موت کی دعائیں مانگنے لگیں۔ انہوں نے ایک سرے سے گڑیا کی صدری ہی چھین لی اور کرتے میں کمر پر ٹانکے لگا دئے۔ ان دن سے ان کا جی گڑیوں کی طرف سے بالکل کھٹا ہو گیا۔ وہ انہیں بالکل کپڑے کا چیتھڑا نظر آنے لگیں جن کی ناک کی جگہ تکونی کلی لگی ہوئی تھی اور انگلیوں کی جگہ ڈورے لٹک رہے تھے۔

❑❑❑

عصمت چغتائی کی سوانح 'کاغذی ہے پیرہن' سے ایک اقتباس

مجھے کہنا ہے کچھ

میر سوا برس کی بیٹی سیما بڑی دیر سے کھڑکی پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں اور شاہد چائے پی رہے تھے مگر کلیجہ بار بار حلق میں آ پھنس جاتا۔ چڑیل منہ کے بل گرے گی۔ کئی دفعہ ہٹایا۔ پھر جٹ گئی۔ تنگ آ کر میں نے اسے جنگلے کے پاس بٹھا دیا۔

بجائے خوش ہونے کے چڑیل ایسی دھاڑی جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو اور مچل کر اتر آئی۔ مگر فوراً ہی پھر چڑھنے لگی۔ بار بار روکنے پر بھی اڑی رہی تو شاہد نے کہا، 'مرنے دو کمینی کو'

'ارے واہ منہ ٹوٹ جائے گا اور صندوق کا کونا کھوپڑی میں گھس گیا تو'

میں پھر اسے اتارنے لگی مگر وہ زور مار کر چڑھ گئی۔ میری سانس رک گئی۔ وہ تالیاں بجا کر اپنی کامیابی پر ہنسنے لگی۔ میں نے اسے نیچے اتار دیا مگر وہ پھر چڑھنے لگی۔

دو چار دن کی مشق سے وہ بڑی پھرتی سے چڑھنے لگی۔

جب جدیدیوں نے لکھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر لپک کر انہیں سنبھالنے کو جی چاہا۔ ہر ایک دوسرے پر ٹالنے لگا کہ وہ ایک مدلل مضمون لکھے۔

'بھی، میں تو نہیں لکھوں گی۔' میں نے فیصلہ کیا۔

'کیوں؟'

'میرے بارے میں جو لکھا گیا، مجھے ملامتیں دی گئیں، ڈانٹا پھٹکارا گیا تو میں نے کب ان کی سنی، فرض کیجئے، یہ نئے نوجوان میری سن بھی لیں تو مجھے سخت ناامیدی ہوگی۔'

'بھئی وہ کیوں؟ کیا بزرگوں کا فرض نہیں کہ وہ نوجوانوں کی رہنمائی کریں؟'

'سچا ادیب وہی ہے جو رہنمائی سے کترا جائے۔ وہی لکھے جو اس کے دل کی گہرائی سے ابھرتا ہے۔ جو وہ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے جو اس پر بیتتی ہے'

اکثر بحثیں ہوئیں کہ پھر میں نے عینی پر کیوں حملہ کیا تھا؟

'عینی ہمارے زمانے سے قریب تھیں۔ ذرا بہکتی تھیں مگر ہمیں ان سے بہت امیدیں تھیں جو پوری ہوئیں۔'

'تو کیا ان نئے ادیبوں سے ناامیدی تھی؟'

'نہیں یہ بات نہیں تھی۔ اصل میں اپنے پلے ہی نہیں پڑتی تھیں اور سب ایک ہی انداز میں لکھ رہے تھے اور یہ فیصلہ مشکل تھا کہ ان میں سے کون اصلی ہیں اور کون نقلی اور بھیڑ میں کیو بنا کر کھو گئے ہیں اور آنکھیں بند کر کے چلتے جا رہے ہیں۔ ان سے یہ کہنا کہ ہماری طرح لکھو، انتہائی خود پرستی ہوگی۔ احمقوں کی طرح اعتراض کرنا خود اپنی کم مائیگی کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کیا معلوم کہ یہ بوٹے پتے کی بات کہہ رہے ہوں۔'

جدیدیت پہلے پاکستان میں پھیلی۔ وہاں بڑی پابندیاں تھیں کھل کر لکھنے پر سزائیں مل رہی تھیں۔ کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ چکی تھی۔ ترقی پسند دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ یہ بات سن اکیاون باون کی ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ ترقی پسند ادب کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر تھا۔ ہندوستان میں بھی کمیونسٹ ادیب، شاعر اور ان کے ہم خیال جیلوں میں بھرے جا رہے تھے۔ حالانکہ بھیمڑی کانفرنس بیحد گھن گرج کے ساتھ قلم کی جگہ تلوار اٹھانے کے حق میں تھی۔ انقلاب دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ وہ وقت آ گیا تھا جب ادیب اور شاعر کو بھی بندوق اٹھانا تھی۔ زور شور کی تقریریں نہایت مرعوب کن تھیں لیکن میں اپنے دل کی بات کہتی ہوں کہ کچھ لفظی ڈراما سا لگ رہا تھا۔ انقلاب ہم نے بھگتا تو تھا نہیں جو پتہ چلتا کیسے آتا ہے مگر جب مظفر شاہجہاں پوری نے کہا۔

اب اجالے میری دیوار تک آ پہنچے ہیں

تو بیحد متاثر ہوئے۔

اور کیفی نے کہا،

کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

تو بے انتہا یقین کرنے کو دل چاہا بلکہ اس وقت تو یقین محکم ہوا۔ یہ بھی تو یقین ہوا تھا کہ انگریز چلا جائے گا تو دیس کی قسمت جاگ اٹھے گی۔ اگر انسان کے پاس یقین بھی نہ ہو تو کیسے جی سکتا ہے۔ یہ یقین پھر وہم ثابت ہو تو پھر ادیب کیا شاعر کا کیا قصور۔ ہاں مغالطہ بیشک کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت جو نعرے اٹھائے گئے تھے، ان پر اتنی ہی ایمانداری سے یقین تھا جتنا جدیدیوں کو اپنی تنہائی، گھٹن، تاریکی اور چند دروازوں کا یقین ہے۔ انسان کا یقین قید نہیں کیا جا سکتا۔

کمیونزم سے امریکہ بیحد خائف ہے۔ ذرا سے

شبہہ پر کمیونسٹ کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ امریکن پر کمیونزم کی بیحد ہیبت طاری ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہاں کمیونسٹوں نے کچھ تباہ کاریاں مچائی ہیں اس سے پہلے کہ امریکہ میں کمیونزم کا بیج پھلتا، جڑ پکڑتا ضرب پڑی اور وہ جغادری سرمایہ دار جنہیں کمیونزم سے خوف آتا ہے کہ ان کی اجارہ داری پر ضرب پڑنے کا خطرہ ہے۔ ایک دم ایک کمیونسٹ ملک کی فتح اور ترقی سے بھونچکے رہ گئے۔

کروڑوں ڈالر کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈے میں خرچ کئے جاتے ہیں۔ جہاں بھی کمیونزم سر اٹھاتا ہے، امریکہ کا پتہ کٹ جاتا ہے۔ نہ وہاں ہتھیار رکھپ پاتے ہیں، نہ خام مال پر قبضہ ہوسکتا ہے۔

سی آئی اے کمیونزم کی بیخ کنی کے لئے کامیاب کدال ثابت ہوچکی ہے۔ مجھے ایک امریکی نوجوان نے بتایا کہ ہندوستان کی ترقی پسند تحریک کمیونزم کا پرچار کرتی ہے اور روس کی طرفدار اور امریکہ کی دشمن ہے۔ ترقی پسند سرمایہ داری کے خلاف زہر اگلتے ہیں اور روس کے گن گاتے ہیں۔ چین سے بھی اس وقت امریکہ بدکتا تھا۔ کیونکہ روس اور چین کی دوستی تھی۔ وہ تو جب ان دو کمیونسٹ ملکوں میں کھنچاؤ پیدا ہوا تو امریکہ چین کو سراہنے لگا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا گو چین اب بھی اکڑا ہی رہتا ہے۔

میں نے اس امریکی نوجوان سے پوچھا کہ 'کیا واقعی ترقی پسند تحریک سے امریکہ کو خوف آتا ہے۔ اتنا دم تو نہیں معلوم ہوتا اس تحریک میں؟'

'ہم لوگ احتیاط میں یقین رکھتے ہیں۔ چھینک آئے تو نمونئے کا امکان ہوسکتا ہے کہ بوند بوند ہی سمندر بنتا ہے۔ اگر پہلی بوند کو ہی طوفان نہ سمجھا تو ہوسکتا ہے انجام خوشگوار نہ ہو۔'

امریکی بہت صاف گو اور کمیونسٹوں کے مقابلے میں بھولے ہوتے ہیں ۔ وہ نوجوان سی آئی اے کی کارگزاریوں کی تفصیل بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا رہا۔ اسے شبہ بھی نہ تھا کہ میرا ترقی پسند تحریک سے کوئی واسطہ ہوگا اور نہ میں نے بتایا۔

'میں سی آئی اے کی گرانٹ پر ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب' پر تحقیقات کے لئے بھیجا گیا ہوں کہ ان کا جھکاؤ کس رُخ ہے، یہی مجھے معلوم کرنا ہے۔

'اور ہندی ادب پر بھی تحقیقات ہو رہی ہیں؟' میں نے پوچھا۔

'وہ دوسرا گروپ ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'

'تمہاری تحقیقات کے بعد کیا ہوگا؟'

'یہ میرا کام نہیں، مجھے صرف اپنے کام سے کام'

'پھر بھی کچھ اندازاً بتاؤ'

'کچھ روک تھام کی جائے گی۔'

'تحریک کو کمزور کرنے کی'

'ہاں'

'کیسے؟'

'جیسے کمیونسٹ اپنے حمایتی بناتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ہمت افزائی کرکے۔'

'تم غیر ترقی پسند تحریک کی ہمت افزائی کروگے؟'

'یقیناً'

'کچھ ہی سال بعد ایک دم ترقی پسند ادیبوں پر حملے ہونے لگے۔'

(۱) ترقی پسند گٹھ بند ہیں۔ اپنوں کو جھنڈے پر چڑھاتے ہیں۔

(۲) ترقی پسند نعرے باز ہیں۔

(۳) ترقی پسندی بس پروپیگنڈہ ہے۔ رومانیت سے خالی، خشک، بے مزہ۔ (جب کہ ترقی پسندوں کے اپنے جریدے یا تو پاکستان چلے گئے تھے اور دم توڑ رہے تھے اور شمع، بانو اور کھلونا میں جو عوامی رسالے ہیں، ان کی تحریریں بڑی دلچسپی سے چھاپی اور پڑھی جاتی تھیں۔)

(۴) ادب میں جمود ہے۔

(۵) ترقی پسند مر گئے، ختم ہوگئے۔

(۶) ترقی پسند نئے لکھنے والوں کی رہنمائی نہیں کرتے۔ (مرنے کا فتویٰ ملنے کے بعد)

سیما سے میں نے بڑے پیار سے کہا، 'سیما! ڈاکٹری پڑھوگی؟'

تنتنا کے بولی، 'نہیں' اور میں چپ ہوگئی۔ میری اماں نے کہا تھا 'شادی کرو'

'نہیں' میں نے کہا تھا اور میری ماں کی ایک نہ چلی تھی۔

جب ادب میں جمود کا فتویٰ دیا گیا تھا تو جو ترقی پسند ادیب تھے وہی سالوں بعد پاکستان اور ہندوستان کے ادیبوں کی رائے سے برصغیر کے عظیم ترین ادیب مانے گئے اور ان کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔

راجندر سنگھ بیدی نے 'ایک چادر میلی سی' اور 'ببل' نہیں لکھی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا، پت جھڑ کی آواز، کار جہاں دراز اور سردار جعفری کی 'نئی دنیا کو سلام' بھی شائد نہیں چھپی تھی۔ 'ایک خواب' اور 'لہو پکارتا ہے' بھی نہیں چھپی تھی۔

ساحر لدھانیوی نے 'پرچھائیاں' نہیں لکھی تھیں۔ اور جیلانی بانو تو شاید گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ ایوان غزل کی چوکھٹ سے بھی انجام تھی۔ آمنہ ابوالحسن نے بھی پیر نہیں نکالے تھے۔ فیض احمد فیض بھی شاید جیل میں تھے۔ احمد ندیم قاسمی شاعر تھے، جب تک افسانے کم ہی لکھتے تھے اور شاید منٹو تو مرنے کے بعد ہی پیدا ہوا۔

ترقی پسند ادیبوں اور جدیدیوں کے درمیان ایک دیوار تعمیر کی گئی اور وہ عظیم معمار وہ تنقید نگار تھے جنہیں ترقی پسندوں نے نظر انداز کیا تھا۔ ان سے اپنی کتابوں کے مقدمے لکھوانے کی التجا نہیں کی تھی۔ ان

کی تنقیدوں کو ایک کان سن کر دوسرے سے اڑا دیا تھا۔ جنہیں عزت اور محبت تو دی تھی، لگامیں ان کے ہاتھوں میں نہیں تھمائی تھیں۔ تجزیئے نہیں کروائے تھے۔

آج تنقید نگاری ہی سب کچھ ہے۔ اس کی بڑی دھونس ہے۔ جو خود تو نہ لکھ سکے، دوسروں کے اناج کی چھان پھٹک سے ہی کھیر کا حصہ لے گئے۔

ترقی پسندوں کی موت کا سرٹیفکٹ دینے کے بعد نئے بچوں کے منھ میں چسنیاں ٹھونس دیں۔ فرد کی اہمیت یعنی جم غفیر سے کراہت، معنی فضول، لفاظی پر زور، کہانی کیا ہے اور کیا نہیں اور ساتھ میں مغرب کے تنقید نگاروں کے وزنی وزنی حوالے، مغربی تنقید نگاروں کو چونکہ جدید ادب کے معماروں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔ ضرور دھونس میں آجائیں گے۔ بھلا ولایتی فرج، ٹی وی، مکسر، استری اتنی قابل فخر اشیاء ہوتی ہیں تو سوچئے کرنٹس کتنے دھانسو ہوں گے۔

ترقی پسند تحریک جدیدیت کے دھوم دھڑکے کے آگے سو گئی۔ کچھ عمر کا تقاضہ کچھ تندرستی کی بے وفائی، ہزاروں فکریں۔

القصہ ترقی پسند ادب مر گیا۔ غریب کو دفن کر دو۔ یہ ضدی کی ایک چوتھائی تک سینہ کوبی کی کیا ضرورت ہے؟

مگر ہٹلر کا قول تھا کہ اگر ایک بات بار بار دہرائی جائے تو جھوٹی بھی سچی معلوم ہونے لگتی ہے۔ تنقید نگار بور کرتے ہوں مگر نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ ایک تو حالات زمانہ اوپر سے رسالوں کی قلت۔ رہ گئے شمع، روبی اور بیسویں صدی، تو وہ قطعی معیاری نہیں۔ نئے نویلے ترقی پسند جو نئے ادیب کی لگام میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ صرف معیاری رسالے نکالنے پر مصر ہیں جو شمع اور بیسویں صدی کی طرح عوام کی دسترس سے بچے رہیں۔ صرف خواص کے لئے مخصوص رہیں۔ جب یہ کہانی اور ساتھی میں ان کے تجزیئے یعنی بالکل سلیقہ سے بوٹیاں کر کے پریشر ککر میں دم دے کر زود ہضم ڈش تیار، نسخۂ استعمال منسلک کہ..... کہیں کسی غبی، کوڑ دھ مغز ائے ہاتھ چڑھ گیا تو بجائے ہولے ہولے مزے لے کر چوسنے کے کڑکڑ چبا جائے گا اور کمبخت کو بدہضمی یقینی، بے چاری جدیدیت۔

مغرب میں ادیب تنقید نگار سے کانپتے ہیں۔ اسی کے قلم کی ایک جنبش موت اور زندگی پر بھاری پڑتی ہے۔ اکثر رشوت وصولی کرتے ہیں ورنہ ایسے اوٹ پٹانگ قطعی سمجھ میں نہ آنے والے تبصرے لکھ دیتے ہیں کہ کتاب قتل ہو جاتی ہے۔ مغرب میں لوگ اشتہار باز کے رحم و کرم پر جیتے ہیں۔ جتنا دھماکے کا اشتہار ہوگا، اتنے ہی فراٹے سے مال بکے گا۔ لوگ اندھا دھند ٹوٹ پڑیں گے جب کہ زیادہ تر مال ناقص ہوگا۔ بس اشتہار کی ٹیکن سے بازار میں ٹک جائے گا۔

تنقید بھی ایک قسم کا اشتہار ہے۔ جو کہانی کوئی ویسے پڑھنے کو تیار نہ ہو، اسے کسی بھاری بھرکم تنقید نگار کی ملکی کے ذریعہ حلق سے نیچے اتار دی جائے اور قاری کو دھونسیائے بغیر بعض جدید چیزیں شاید پچھاڑے بغیر نہ پلائی جاسکیں۔

مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ قاری کی مقدار جہاں تک اردو کا معاملہ ہے، دن بدن مختصر ہوتی جاتی ہے۔ زیادہ تر ایسا طبقہ پیدا ہو رہا ہے جو کتاب کے بجائے سنیما کی ٹکٹ کی خریداری میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے یا شمع، روبی فلمی رسالے پسند کرتا ہے۔ بھلا امیتابھ بچن، ریکھا، دھرمیندر اور ہیما مالنی کے رومانوں کے آگے بیچارے فرد کی تنہائیوں، اندھیروں اور بند دروازوں کی کیا چل سکتی ہے۔

کبھی ترقی پسند تحریک کا مدعا تھا کہ عوام تک پہنچا جائے۔ آج عوام پسند رسالوں پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ فلموں کے ذریعہ روزی کمانے کو نہایت نیچا اور اکیڈمیوں کے ذریعہ ادب نوازی نہایت بلند و بالا! حالانکہ بڑے بڑے ادبی سورما فلمی دنیا میں دھنسنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کبھی ادب نوازی ادب کی خاطر کی جاتی تھی۔ آج اکیڈمیوں کی مہربانی کی محتاج۔ روزی اور اہمیت حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی جارہی ہے۔

تنقید نگار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ خود بھی کہانی یا شعر لکھنا جانتا ہو۔ وہ تو بالکل ڈاکٹر کی طرح چیر پھاڑ کے فن میں یکتا ہوتا ہے۔

اس تنقید نگار کا کیا بھروسہ جو کل تک جدیدیت کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ آج پھر ترقی پسندی کا دامن تھام رہا ہے۔ کیا ادیب .....ہی مقصد تنقید ہے۔

اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ تنقید نگار نے کیا جادو کی چھڑی گھمائی ہے کہ آج ہر صاحب قلم تنقید پر اتر آیا ہے اور تو اور جوگندر پال، انور عظیم اور عابد سہیل بھی اس میدان میں اتر آئے۔ ادیب یعنی شاعر اور کہانی کا ناول نگار اتنا پچک گیا ہے کہ اسے تنقید کی ہوا بھرنے کی ضرورت پڑ رہی ہے ورنہ غبارہ نہیں اڑے گا۔

قاضی عبدالستار سے بات ہوئی کہ یہ تنقید پر کیوں بول دیا، کہنے لگے 'بھئی ڈپارٹمنٹ میں بھاری بھرکم مقالوں کی قدر ہوتی ہے۔ تنقید نگار کا ایک رتبہ بنتا ہے۔' یعنی ریڈر سے ڈین آف فیکلٹی یا پروفیسری کے لئے ضروری ہے کہ آپ کوئی وزنی پتھر ڈھوئیں تب ہی رعب پڑے گا۔ ان کہانیوں اور شاعری سے ترقی کے دروازے نہیں کھولے جاسکتے ہیں۔

فلم ایکٹر جب کوئی اچھا رول مانگتی ہے تو اپنی سب سے بھاری ساڑی پہن کر پروڈیوسر سے ملنے جاتی ہے۔

کوئی بھی 'معیاری' رسالہ اٹھا لیجئے۔ بس یہی لکھا ہوگا کہ کیسے لکھوں، کیا لکھوں؟ یا خدایا! ہتکئے ہرنوں کے غول کب تک ہانکتے رہیں گے۔

❑❑❑

دھرتی کے ایک حصے کی

پانی پر تیرتی کہانی

رتن سنگھ
A-402، بیٹا۔ا، گریٹر نوئیڈا
موبائل: 9911146994

ایسی تفصیل
کہ وہاں جدھر دیکھو
جھیل ہی جھیل
ہر طرف پانی ہی پانی
اسے دیکھ کر آنکھیں
حیرانی، حیرانی
ان جھیلوں کا پانی
جب جھلملاتا ہے
تو دماغ کا کونہ کونہ
روشن ہو جاتا ہے
میں وہاں گیا
تو ساحل پر تیرتی
ایک مچھلی نے کہا
میرے پاس ایک کہانی ہے
آپ کو سنانی ہے
یوں کہہ کر وہ کہانی سنانے لگی
تو وہاں کی فضا بھی گنگنانے لگی
یہاں ایک بار ایک پینٹر آیا تھا
اسے یہاں کا ماحول بہت بھایا تھا
جھیل کو دیکھتے ہی
دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا
اس کا دل تو جیسے
پانی کی لہروں کے ساتھ ہی بہہ گیا
اس کے ہاتھوں نے برس سنبھالا
اور جھیل کی تصویر بنانے لگا
اس نے ایسی تصویر بنائی
کہ وہ جھیل ہی کاغذ پر اتر آئی
جھیل کی لہروں سے کاغذ
بھیگا بھیگا سا لگتا تھا
اس نظارے کو دیکھ کر
کسی کا من نہیں بھرتا تھا
تبھی جھیل کی طرف سے
ہوا کا ایک جھونکا آیا
اور پینٹر کی بنائی تصویر کو
اپنے ساتھ اڑا لے گیا
ایسا ایک بار نہیں
کئی بار ہوا
ادھر پینٹر کی تصویر پوری ہوتی
ادھر جھیل کی ہوا
اسے بہا لے گئی
پینٹر ان باتوں سے بے نیاز
اس کا برش چلتا رہا
اور کاغذ پر
جھیل کے رنگ بھرتا رہا
اس کے ارادوں کو دیکھ کر
وہ جھیل
مجسم دیوی کے روپ میں ڈھلی
اور پینٹر کے سامنے آ کھڑی ہوئی
اس کا حسن بے مثال
جمال ہی جمال
قدرت کا وہ کرشمہ
جھلملاتا تھا
اور پینٹر اسے نظر بھر کر
دیکھ نہیں پاتا تھا
اس کی آنکھیں چندھیا گئیں
ٹانگیں لڑکھڑا گئیں
اور وہ اس کے قدموں میں گر گیا
اور گڑگڑا کر بولا
'اے حسن کی دیوی تجھ دیکھ کر
میں قدرت کی کاریگری میں
ایمان لاتا ہوں
اب جاتا ہوں
اور دنیا کو بتاتا ہوں
کہ قدرت کا دیدار کرنا ہے
تو ان جھیلوں کو دیکھنے جاؤ
انہیں دیکھو اور
حسن کی طاقت پر ایمان لاؤ
اور زندگی کو ایسا خوبصورت بناؤ
دھرتی کا کن کن
اس جھیل کی طرح ہی
ہر ہر ہو جائے
اور دنیا، ساری دنیا
خوبصورتی کا بحر ہو جائے
پینٹر کے یہ الفاظ سن کر
سامنے کھڑی جھیل کی دیوی نے کہا
خوبصورت دنیا کا سپنا دکھا کر
تم نے خوش کر دیا
لو! اپنی یہ ساری تصویریں لیتے جاؤ
اور انہیں
افق کے کونے کونے میں ٹانگ دو
تا کہ یہ دنیا، کل دنیا
ان تصویروں کو دیکھ کر
مجھے دیکھنے آئے
اور اس فن کے خالق پر ایمان لائے
یہ کہہ کر جھیل کی طرف جانے کے لئے مڑی
تو میری کہانی بھی ختم ہو گئی
ختم ہوتے ہوتے کہانی کہہ رہی ہے
کہ میرے الفاظ میں بھی
ایک جھیل بہہ رہی ہے ❑❑❑

لافنگ بدھا

تبسم فاطمہ
A-402، بیٹا۔ا، گریٹر نوئیڈا
موبائل: 9911146994

اس نے پلٹ کر لافنگ بدھا کی طرف دیکھا۔ ایک معصوم سا کھلونا۔ لیکن اس گول مٹول سے کھلونے کے چہرے کی ہنسی، مونالزا کی مسکراہٹ سے کم نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر خوفزدہ نگاہوں سے لافنگ بدھا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔ وہ اس ہنسی میں الجھتی ہوئی بہت دور نکل گئی تھی۔

یہ کھلا کھلا گھر تھا۔ لیکن یہاں گھٹن، اس کے گھر سے کہیں زیادہ تھی۔ یہاں روزن اور کھڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن کھڑکی کے باہر سوکھے درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہریالی نام کو نہیں۔ ایک قطار سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک میڈل کلاس فیملی تھی۔ اور وہ کون سا ٹاٹا، امبانی کے گھر سے آئی تھی۔ نیرج سیدھے سادے تھے۔ ایک چارٹر اکاؤنٹنٹ کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ ڈھنگ کا کما لیتے تھے۔ بولتے کم تھے۔ ان کی آنکھیں زیادہ بولتی تھیں۔ نیرج کی دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن ڈیورس کے بعد ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ چھوٹی بہن گرجا کے چال چلن اچھے نہیں تھے۔ یہ بات اسے یہاں آنے کے بعد معلوم ہوئی۔ گھر والے گرجا سے بہت پریشان رہتے تھے۔ لیکن اس کی دلچسپی گرجا میں تھی۔ گرجا اکیلی ہوتی تو اس کی بہت کچھ پوچھنے کی خواہش ہوتی۔

ایک بار گرجا نے دو تین لڑکوں کی تصویریں دکھائیں۔ یہ سب گرجا کے دوست تھے۔ اس نے مرد دوستوں سے اپنے تعلقات کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا، لیکن اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ان لڑکوں سے گرجا کے تعلقات بھی رہے ہوں گے۔ وہ پڑھ رہی تھی۔ کبھی کبھی دیر سے گھر لوٹتی تو نیرج بگڑ جاتا بی گرجا نیرج کو کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ تھا اور اس کا موبائل بی ایک دفعہ نیرج نے ماں سے شکایت بھی کی۔

'گرجا غلط راستہ پر جا رہی ہے۔'

ماں پہلے ہی بڑی بیٹی وسودھا سے پریشان تھی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وسودھا بھی اپنے لیے راستہ بنا رہی ہے۔ جب آپ کے لیے راستے بند ہو جاتے ہیں، تو آپ کو ایک نیا راستہ کھولنا ہوتا ہے۔ وسودھا یہی کر رہی تھی، اور اس چکر میں محلے کے رنجیت ماسٹر سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ رنجیت عاشق مزاج تھے۔ محلے کے کئی گھروں میں جانا ہوتا تھا۔ بیوی سے بنتی نہیں تھی۔ دو ایک بار وسودھا نے باتیں کیا کیں، خیر خیریت پوچھنے چلا آتا۔ یہ بات نیرج کو پسند نہیں تھی۔ گرجا کے چہرے پر رنجیت کو دیکھ کر ایک پر اسرار مسکراہٹ پیدا ہو جاتی۔ وہ وسودھا کی چھٹپٹاہٹ کا لطف لیتی۔ ماں اس معاملے میں چپ رہتی تھی۔ وہ اس بات کو سمجھتی تھی۔ ماں چاہتی تھی کہ وسودھا پھر سے گھر بسا لے۔

گھر میں سب سے دلچسپ اور انوکھا کردار بابو جی کا تھا۔ وہ پتھر کی مورت واقع ہوئے تھے۔ بلڈ پریشر اور شوگر کے مریض تھے۔ وہ کچھ بولتے نہیں تھے ایسے موقع پر کمرے سے ان کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں آتی تھیں۔ ارے مر گیا..... کوئی ہے..... کوئی پوچھتا ہی نہیں۔' وہ جانتی تھی کہ رنجیت کی موجودگی نے سب کو الگ الگ اپنے حصار میں جکڑ لیا ہے۔ وسودھا، جو ملنا چاہتے ہوئے بھی مجبور ہے۔ گرجا، جو وسودھا کی بے بسی کا مزا لیتی ہے۔ بابو جی، جنہیں اچانک درد شروع ہو جاتا ہے اور ماں، جس کی نگاہیں تب تک گدھ کی طرح وسودھا اور رنجیت کے آس پاس بھٹکتی ہیں، جب تک رنجیت چلا نہیں جاتا۔ ایک دن کپڑے پسارتے ہوئے اس نے نیرج کو طعنہ مارا۔

'تمہاری بہنوں کے تو مزے ہیں۔'

'کیا۔' نیرج چونک گیا۔

'ایک کے لیے رنجیت آتا ہے۔ اور دوسری بوائے فرینڈ کے ساتھ سارا دن غائب رہتی ہے۔'

نیرج نے غصے سے کہا۔ 'کیوں سنا رہی ہو یہ سب۔'

یہ کھلا کھلا گھر تھا۔ لیکن یہاں گھٹن، اس کے گھر سے کہیں زیادہ تھی۔ یہاں روزن اور کھڑکیاں بھی تھیں۔ لیکن کھڑکی کے باہر سوکھے درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہریالی نام کو نہیں۔ ایک قطار سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک میڈل کلاس فیملی تھی۔ اور وہ کون سا ٹاٹا، امبانی کے گھر سے آئی تھی۔ نیرج سیدھے سادے تھے۔ ایک چارٹر اکاؤنٹنٹ کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ ڈھنگ کا کما لیتے تھے۔ بولتے کم تھے۔ ان کی آنکھیں زیادہ بولتی تھیں۔ نیرج کی دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن ڈیورس کے بعد ماں باپ کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ چھوٹی بہن گرجا کے چال چلن اچھے نہیں تھے۔

'سنا نہیں رہی ہوں۔ بتا رہی ہوں۔'

'لیکن کیوں؟'

'تمہاری بھی زندگی ہے تم بھی مزے کرو۔'

'مطلب۔؟' رنجیت ایکدم سے چونک گیا

وہ ہنستی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ نیرج پر یہ تیرا پنا کام کر گیا ہے۔ ایک بار نیرج کا ایک دوست گھر آیا تھا۔ اس نے بھی ہنستے ہوئے کہا تھا۔ 'بھابھی، اسے باندھ کے رکھو، ورنہ کسی دن اڑ جائے گا۔'

اس نے دل میں سوچا۔ وہ یہی تو چاہتی ہے۔ پنچھی اڑ جائے۔ تبھی تو اسے بھی اڑنے کا موقع ملے گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ زندگی اسے عجیب سی لگتی تھی۔ وسودھا اور گرجا میں کوئی بھی اسے غلط نہیں نظر آتا تھا۔ ایک زندگی تو ملتی ہے جینے کے لیے پھر یہ زندگی آزادی کے ساتھ کیوں نہیں جی جائے۔؟ یہ کیا، کہ بس ایک کھونٹ سے بندھ کے رہ جاؤ۔ وہ اپنی سہیلیوں کو جانتی تھی، جن کے کالج کے دنوں میں کئی کئی بوائے فرینڈ ہوا کرتے تھے۔ ہر دن موج و مستی کے ساتھ گزرتا۔ اب شادی ہوگئی تو پتی ورتا ہونے کا ناٹک چل رہا ہے۔ وہ مکھوٹا لگا کر نہیں جی سکتی۔ اس لیے اسے ایسے ناٹک پسند نہیں تھے۔

وہ چاہتی تھی، کہ ایک دنیا نیرج کی بھی ہو، جس میں اس کے علاوہ بھی کوئی ہو۔ ایسی ایک دنیا آزادی کے ساتھ اس کی بھی ہو۔ گرجا کی رومانی دنیا سے اسے جلن ہوتی تھی۔ وسودھا کے آگے بڑھنے کی آزادی اسے خوش کرتی تھی۔ لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ ہوا کہ وسودھا کی آزادی کے آگے بریک لگ گیا۔

دس بجے کا وقت ہوگا۔ اچانک دھڑ دھڑاتے ہوئے گھر میں کئی لوگ داخل ہو گئے۔ ان میں ایک رنجیت ماسٹر کی بیوی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دو پہلوان بھائی بھی تھے۔ رنجیت کی بیوی زور زور سے چلاتی ہوئی وسودھا پر برس رہی تھی۔ پہلوان بھائیوں کی حالت یہ تھی کہ ذرا سا موقع ملے تو گدھ کی طرح وسودھا کو نوچ کھائیں۔ نیرج نے کسی طرح وسودھا کا بچاؤ کیا۔ گرجا آدھے بند کمرے سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ بابو جی اپنے کمرے میں بند ہو کر چیخ رہے تھے۔ ماں کا چہرہ کسی لاش کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

نیرج نے بچاؤ کا انداز اپنایا بی' آپ لوگوں سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔؟'

'کوئی غلطی نہیں جی۔ عشق مٹکا کرنے کے لیے روز اسکول پہنچ جاتی ہے۔ جھوٹ ہو تو اسکول جا کر پوچھ لو۔ اور رنجیت بھی تو آئے دن تمہارے گھر کا چکر لگاتا ہے۔ کیوں چکر لگاتا ہے؟ گھر جمائی ہے جو روز آنے دیتے ہو۔؟'

نیرج نے معافی مانگ لی۔ ہاتھ جوڑ دیا۔ 'اگر ایسا ہے تو اب نہیں ہوگا۔ آج سے نہیں ہوگا۔ نہ یہ اسکول جائے گی اور نہ کوئی یہاں آئے گا۔'

رنجیت کی بیوی پھر چڑھ دوڑی۔ 'ارے مجھے مت پڑھاؤ یہ سب۔ تم تو سارا دن آفس رہتے ہو۔ تمہیں کیا پتہ لگے گا۔ ایک کو پتی نے چھوڑا۔ گھر بیٹھ تم تو یہی چاہو گے کہ کسی طرح کوئی جگاڑ لگ جائے.....'

'جگاڑ' بی نیرج نے بے بسی سے پہلوان بھائیوں کی طرف دیکھا۔ آپ انہیں لے جائیے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا ہوں۔

'ٹھیک ہے۔ ہم جاتے ہیں۔ لیکن آگے ایسا ہوا تو خیریت نہیں۔'

پہلوان بھائی اپنی بہن کے ساتھ لوٹ گئے۔ اس دن پہلی بار نیرج نے وسودھا پر ہاتھ اٹھایا۔ نرلج۔ اسی لیے پتی نے ڈیورس دیا ہوگا۔ اب یہاں بھی نین مٹکا شروع ہو گیا۔ آس پاس کیا عزت رہی ہماری۔'

اس دن وہ دیر تک گھر کی دیوار پر کائی کی طرح جم گئے دھبوں کو دیکھتی رہی۔ یہ دھبے کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں بی؟ مرد کچھ بھی کر لے اس کی عزت کو کوئی خطر نہیں رہتا۔ عورت ذرا سا چوکھٹ پار کر لے تو مرد کی ناک کٹ جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی، نیرج کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

طلاق کے بعد وسودھا کے نچے ہوئے پر ایک بار پھر کاٹ دیئے گئے۔ اس دن روتی ہوئی وسودھا کو اس نے تسلی دی تو اس کے اندر کا باندھ ٹوٹ گیا۔

'مانگ صرف مردوں کے اندر ہوتی ہے کیا بی؟ ہم عورتوں کے اندر جسمانی مانگ نہیں ہوتی؟ ہم میں سے ہر عورت اس مانگ کو ختم کرنے کے لیے شرافت کا ایک پل بنا دیتی ہے۔ یہ پل صرف ایک مرد تک جاتا ہے۔ جو اس کا اپنا مرد ہوتا ہے۔ اور اگر یہ مرد ٹھکرا دے تو؟ وہ کتنے دنوں تک سیلاب کو روک سکتی ہے.....؟ پانی کا زور آئے گا تو پل تو ٹوٹے گا ہی.....'

وسودھا نے نم آنکھوں کو خشک کیا۔ اس دن اس نے گرجا کو بھی پریشان دیکھا۔ پہلی بار اس نے سیلاب کی آہٹ کو محسوس کیا۔ جیسے تیز تیز سمندر کی لہریں ہوں جو تیزی سے اس کے گھر کی طرف بڑھ

رہی ہوں۔ وسودھا کا جملہ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی دیر تک اس کے کانوں سے ٹکراتا رہا..... 'یہ پل صرف ایک مرد تک جاتا ہے۔' وہ سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ اگر اس پوری کائنات کے نظم میں ایک مرد، عورت کو سمجھنے والا نہ ہوتو بی؟ عورت اس پل سے ہوکر الگ الگ دشاؤں میں کیوں نہیں جاسکتی بی؟ اگر ایک چھوٹی سی دنیا میں، زندہ رہنے کے لیے ضروری رومانیت کے تصور کو، کوئی مرد نہ سمجھنا چاہے تو بی؟ پل کو کیوں نہیں توڑا جاسکتا؟ لیٹے لیٹے اس نے نیرج کو آواز دی۔

'سو گئے کیا؟'

'نہیں۔ کیوں؟'

'مجھے بتاؤ گے، وسودھا کی غلطی کیا تھی؟'

نیرج ایکدم سے چونک پڑا۔ 'مطلب؟'

'مطلب یہ ہے کہ وسودھا کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ کچھ سیلاب ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت کچھ بہا کر لے جاتے ہیں۔'

اس نے سچ کہا تھا۔ آنے والے کچھ مہینوں میں چپکے سے آیا ہوا سیلاب بہت کچھ بہا کر لے گیا۔ کتنی خاموشی سے کچھ کہانیاں بند ہوجاتی ہیں۔ کتنی خاموشی سے زندگی کے بڑھتے سفر میں اچانک بریک لگ جاتا ہے۔ کچھ چہرے گم ہوجاتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ کبھی ہمارے آس پاس بھی تھے۔ ایک دن وسودھا گم ہوگئی۔ بغیر کسی کو کچھ بتائے۔ اس دن بابو جی نہیں چیخے۔ وہ دیر تک گھر نہیں آئی۔ لیکن کسی نے اف آئی، آر لکھوانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ دوسرے دن بھی نہیں آئی۔ پریشانی صرف گرجا کو تھی لیکن تیسرے دن گرجا بھی مطمئن تھی۔ بابو جی کھا پی کر اپنے کمرے میں ہی رہے۔ ماں پتھر کے مجسمے کی طرح دیوار پر جمے دھبوں کو دیکھتی رہتی مگر اس کے منہ پر کبھی وسودھا کا نام نہیں آیا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینہ گزر گیا۔ نیرج اور گھر والوں کے لیے امید سے بھرا مہینہ، اس ایک مہینے میں ایک طوفان خاموشی سے گزر گیا تھا۔ وہ گہرے صدمے میں تھی بی یا وسودھا پہلے اس گھر میں تھی بی؟ کیا وسودھا اس گھر کے لوگوں کو پہلے بھی کوئی لگاؤ تھا بی؟ کیا وسودھا کی زندگی یا گم ہونے سے کسی کو کوئی مطلب نہیں ہے؟ پھر ایک دن گرجا گم ہوجائے گی۔ پھر ایک دن وہ بھی گم ہوسکتی ہے۔ کیا کسی کو فرق پڑے گا؟ اسے لگا وسودھا نے اس رات کی گفتگو کے بعد وہ پل توڑ دیا ہو۔ وہ سیلاب کے پانی میں بہتی ہوئی دور چلی گئی ہو۔ ہم صرف اپنے لیے جیتے ہیں۔ اور اس زندگی میں، اپنے لیے، پل سے الگ الگ جاتے ہوئے راستوں کے بارے میں غور کرتے رہتے ہیں۔

کچھ مہینے اور گزر رے۔ گرجا کو ایک لڑکا پسند آ گیا تھا۔ دونوں نے کورٹ میرج کرلی۔ نیرج پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ ایک دن وہ اپنے پتی کے ساتھ گھر آئی۔ وہ ایک دبلا پتلا سلیس مین تھا۔ گرجا نے صاف کہا کہ جب تک ماں باپ زندہ ہیں، وہ کبھی کبھی آجایا کرے گی۔ کسی کو بھی اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی برا وقت آیا تو وہ وسودھا کی طرح گھر نہیں لوٹے گی۔ وہ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔'

ایک ساتھ کتنے پٹاخے چھوٹتے چلے گئے۔ وہ بچپن کے جھولے پر سوار تھی جہاں وہ کسی بات کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ، بھول گئی تھی کہ اگر وہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو کوئی بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس کا زندہ رہنا ایسا ہی ہے جیسے اس کا گم ہوجانا۔ اسے وسودھا کی بات یاد آرہی تھی..... 'پانی کا زور آئے گا تو پل ٹوٹے گا ہی۔' پہلی بار اسے لگا، کیا اس گھر کو اس کی ضرورت ہے؟ نیرج کو؟ نیرج کے ماں باپ کو؟ یا کیا اس کے ماں باپ کو اس کی ضرورت تھی بی؟ ایک ہولناک سناٹا اس کے ذہن میں آباد ہورہا تھا۔ اس نے انٹریر ڈیکوریشن کا کورس کیا تھا۔ یہ اس کا ذاتی فیصلہ تھا کہ اب وہ جاب کرے گی۔

نیرج کے اچھا برا ماننے کی اسے پرواہ نہیں تھی۔ تھوڑی بہت تلاش کے بعد اس نے ایک اچھی کمپنی جوائن کرلی۔ اور اچانک ایک دن دفتر میں کمپیوٹر پر کام کرنے کے دوران اسے احساس ہوا کہ کچھ تیز لہریں ہیں، جو اچانک اس کے جسم میں داخل ہورہی ہیں۔ نیرج کی موجودگی میں بھی اس نے ان لہروں کو کبھی اس طرح جاگتے ہوئے محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ یہ بتانے میں ناکام ہے کہ نیرج اور اس کے درمیان دراصل رشتہ کیا تھا بی؟ ایک ایسا رشتہ جہاں جسم کھلنے کے باوجود محبت کا کوئی افق روشن نہیں ہوتا۔ محبت کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا..... اس وقت کچھ لہریں تھیں جو اس کے اندر گنگنا رہی تھیں..... مچل رہی تھیں۔ اس نے نظر اٹھائی تو سامنے ماتھر کھڑے تھے۔ کمپنی کے مالک۔ پینتالیس سال کا ایک خوبصورت جوان۔ مسٹر ماتھر نے اسے اپنے کیبن میں آنے کے لیے کہا..... پہلی بار اس نے ماتھر سے بہت کچھ سیکھا۔ جیسے یہ، کہ یہ زندگی تمہاری ہے رجنی۔ تمہیں اپنے حساب سے اپنی شرطوں پر جینا چاہیے۔ مدت کے بعد اس نے کسی اور کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔ اسے لگا کوئی ہے جو اسے جانتا ہے یا

> اس نے سچ کہا تھا۔ آنے والے کچھ مہینوں میں چپکے سے آیا ہوا سیلاب بہت کچھ بہا کر لے گیا۔ کتنی خاموشی سے کچھ کہانیاں بند ہوجاتی ہیں۔ کتنی خاموشی سے زندگی کے بڑھتے سفر میں اچانک بریک لگ جاتا ہے۔ کچھ چہرے گم ہوجاتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ وہ کبھی ہمارے آس پاس بھی تھے۔ ایک دن وسودھا گم ہوگئی۔ بغیر کسی کو کچھ بتائے۔ اس دن بابو جی نہیں چیخے۔ وہ دیر تک گھر نہیں آئی۔ لیکن کسی نے اف آئی، آر لکھوانے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ دوسرے دن بھی نہیں آئی۔ پریشانی صرف گرجا کو تھی لیکن تیسرے دن گرجا بھی مطمئن تھی۔

جاننا چاہتا ہے۔ پھر کچھ ملاقاتوں میں ماتھر سے اس نے اپنے اور نیرج کے تعلقات کا ذکر کیا۔ ماتھر نے قہقہہ لگایا۔ ہم اکیلے آتے ہیں اور اکیلے ہی چلے جاتے ہیں رجنی بی رشتہ ناطے، سب یہی رہ جاتے ہیں۔

اس رات وہ گھر آئی تو کافی خوش تھی۔ اس رات نیرج نے بھوک مٹانے کی کوشش کی، تو اس نے منع کر دیا۔

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'موڈ نہیں ہے۔'

'لیکن میرا موڈ ہے۔'

'میں تمہارے موڈ کی پرواہ نہیں کرتی۔' اس نے ٹکا سا جواب دیا اور کروٹ لے کر سو گئی۔

دوسرے دن ماتھر نے پھر اپنے کیبن میں بلایا۔ کافی پیش کی۔ کچھ دیر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔

'جانتی ہو رجنی۔ چھل کیا ہے؟ دھوکہ کیا ہے؟ دراصل ہم ساری زندگی خود کو دھوکہ دیتے ہیں بی دھوکہ صرف خود کو دیا جاتا ہے۔'

'وہ کیسے سر۔؟'

'محبت خود سے ہونی چاہیے۔ ہم خود سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں خود سے سوال کرنا چاہیے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔؟ لیکن ہوتا اس کا الٹا ہے رجنی۔ ہم دوسروں کی چاہتوں کے نام زندگی کر دیتے ہیں۔ سماج نے رشتے، ناطے، رسم، رواج، کے بڑے بڑے مجسمے لگا رکھے ہیں۔ ہم ان میں کھو کر اپنی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ یہ دھوکہ ہے۔ خود کے ساتھ۔'

اس دن پہلی بار ماتھر نے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ خود سے اب کوئی چھل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس دعوت کو اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔

چھٹی کا دن تھا۔ اسے تیار ہوتا دیکھ کر نیرج چونک پڑا۔ اس نے بتایا کہ باس نے بلایا ہے۔ گھر کے ڈیکوریشن کا کام ہے۔ نیرج نے پھر پوچھا۔ پھر تو ایکسٹرا پیسے ملنے چاہئیں۔ اس نے پلٹ کر نیرج کو دیکھا۔ نیرج نے اپنی بات جاری رکھی۔ کام کرتے ہوئے تھک گیا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ کچھ پیسے مل جائیں تو اپنا کام شروع کروں گا۔ اس نے ایک فاتح کی نظروں سے نیرج کو دیکھا بی وہ وسودھا نہیں تھی بی اس

وقت وہ گرجا بھی نہیں تھی بی اس وقت نیرج بھی نیرج نہیں تھا۔ وہ اسے ایک کمزور انسان نظر آیا، ایک ایسا انسان جو خود سے چھل کر رہا تھا۔

لوہے کا ایک بڑا آہنی دروازہ۔ دروازے کے پاس سیکوریٹی گارڈ کے ساتھ ایک پہریدار تھا۔ نام بتانے کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ ماتھر نے شاید اس کے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ گیٹ کے باہر ایک بڑا سا لان۔ کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سیکوریٹی گارڈ نے راستہ بتایا۔ اس نے بنگلہ کی خوبصورتی کا جائزہ لیا۔ پھولوں کے درمیان پتھروں کے کئی نایاب مجسمے رکھے تھے۔ اس نے اندر جانے والے دروازے کے پاس قدم رکھا۔ شیشے کا دروازہ تھا جو اس کے قدم رکھتے ہی ذرا سا کھل گیا۔ اندر بڑا سا ہال تھا۔ چاروں طرف اونچی، پتھروں کی خوبصورت دیواروں پر، بڑی بڑی پینٹنگس جھول رہی تھیں۔ اسے ایک عورت نظر آئی۔ خوبصورت، لانبا قد۔ جینس اور ٹی شرٹ پہنے لیکن چہرے پر کسی ملکہ کی طرح غرور بی سیکوریٹی گارڈ نے اسے مہمانوں کے کمرے میں پہنچایا۔ دو منٹ بعد ہی ماتھر مسکراتا ہوا سامنے تھا۔ ادھر ادھر کی رسمی گفتگو کے بعد اس نے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا جو باہر اسے ملی تھی۔ ماتھر مسکرایا۔

'میری بیوی ہے۔'

'وہ تو بہت خوبصورت ہے۔'

ماتھر پھر زور سے ہنسا بی 'تم جس دروازے سے آئی ہو، وہاں تمہیں بہت سے مجسمے نظر آئے ہوں گے۔ یہاں بھی دیکھو۔ یہاں چاروں طرف مجسمے لگے ہیں۔ میری بیوی بھی ایک خوبصورت مجسمہ ہے۔ قیمتی پتھر۔'

'وہ میری موجودگی کا برا تو نہ مانیں گی۔؟'

'کیوں؟' ماتھر ہنسا بی 'ہم ایلیٹ کلاس والے ہیں۔ یہاں بڑی سے بڑی باتوں کا برا نہیں مانا جاتا۔ بلکہ سب کچھ پہلے سے پتہ ہوتا ہے۔ یہاں سب کو آگے جانے کا راستہ پتہ ہے۔ اور پیچھے جانے کا بھی۔ ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کی زندگی میں دخل نہیں دیتا۔'

پھر ماتھر نے اپنا گھر دکھایا۔ اسے بار بار احساس ہوتا رہا کہ ہر مجسمے کے اندر ایک زندگی ہے بی دیواروں میں بڑی بڑی آنکھیں ہیں۔ پتھروں میں چیخیں ہیں۔ ماتھر کی بیوی اسے دوبارہ نظر آئی۔ مگر نہ ماتھر کی بیوی کو اس سے کچھ جاننا تھا نہ اسے کچھ ماتھر کی بیوی سے۔ ماتھر نے بتایا کہ گھر کے ڈیکوریشن کا کچھ کام باقی ہے۔ وہ کچھ دن آفس کی جگہ یہیں کام کرے۔ اس نے منظور کر لیا۔ لیکن ایک حقیقت اور بھی تھی۔ وہ یہاں کے مجسموں سے ڈر گئی تھی۔ اسے اس

تبسم فاطمہ

بات کا بھی احساس تھا کہ کہیں اسے بھی اس گھر میں مجسمہ بن کر نہ رہنا پڑے۔ وہ اپنے اندر تیز لہروں کی آہٹ سن رہی تھی۔ وہ گھر سے بہت کچھ سوچ کر چلی تھی۔ اس لیے زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا جب اپنی مرضی سے اس نے خود کو ان آوارہ لہروں کے حوالے کردیا بی کوئی کام مرضی سے کیا جائے تو غم نہیں ہوتا۔ اسے بھی اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

اس رات نیرج نے پوچھا کہ نئے کام میں اسے کتنے پیسے ملیں گے بی؟ اس نے جواب دیا۔ پریشان مت ہو۔تم اپنا بزنس شروع کرسکو گے.....اس کے بعد نیرج نے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر سوگیا۔

اسے وسودھا یاد آرہی تھی۔ وہ ایک ایسے پل پر کھڑی تھی، جہاں سے کوئی بھی راستہ کسی کی طرف نہیں جاتا تھا بی ہر راستہ لوٹ کر اس کی طرف ہی آتا تھا۔ یہی تو ماتھر نے کہا تھا۔ دراصل ہم خود سے دھوکہ کرتے ہیں بی مجسموں کے درمیان کئی دن گزر چکے تھے۔ اس درمیان اس نے یہ بھی جانا کہ بے زبانی کی بھی زبان ہوتی ہے۔ پتھر کے مجسمے بھلے کچھ نہ کہتے ہوں مگر ان کے اندر سے نکلنے والی آوازوں کو سنا جاسکتا ہے۔ ماتھر کی بیوی اسے ایک ایسی عورت معلوم ہوئی جو زندہ ہوتے بھی زندہ نہیں تھی۔ نیرج اور ماتھر کی بیوی میں فرق تھا۔ نیرج بھی سب کچھ جانتا تھا مگر اس کے سامنے ایک ٹارگیٹ تھا۔ بزنس بی وہ اپنا بزنس شروع کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماتھر کیا چاہتا ہے بی؟ ایلیٹ کلاس کے یہ شریف لوگ ہزاروں میں ایک کا انتخاب کرتے ہیں بی وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی اسٹنگ آپریشن ان کی شرافت کو بے نقاب نہ کردے۔ یہاں سب مجسمے ہیں۔ وسودھا اور گرجا کے لیے اس کی محبت جاگ رہی تھی۔ وسودھا بھی مجسمہ نہیں تھی۔ ایک ردعمل تھا اس کے اندر۔ گرجا بھی مجسمہ نہیں تھی بی اسے ان لوگوں سے بھی ہمدردی تھی، جنہوں نے غصہ میں آکر اپنی بیوی یا شوہر کو صرف اس لیے ہلاک کردیا کہ ان کے تعلقات دوسری عورت یا دوسرے مرد سے تھے۔ کچھ لوگ ابھی بھی بازار کا حصہ نہیں بنے ہیں۔ اسے بھی نہیں بننا ہے۔

اس دن وہ ماتھر کے کمرے میں تھی۔ برسات شروع ہوگئی تھی۔ پھر بارش تھم گئی۔ وہ کپڑے پہن کر باہر آئی تو ایک مجسمہ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے دنوں میں پہلی بار ماتھر کے جسم سے آنے والی بدبو کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس بدبو کا ساتھ بہت دنوں تک گوارہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسے یقین تھا، ایک دن ماتھر اس کے ساتھ یہی کرنے والا ہے۔ وہ ماتھر سے ہاؤس ڈیکوریشن کے نام پر ایڈوانس چیک لے چکی تھی۔ چیک لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ ماتھر کے لیے اس مسکراہٹ کو سمجھنا آسان نہیں تھا۔ اس دن پہلی بار اس نے خود کو ہلکا اور تروتازہ محسوس کیا۔ ماتھر نے مسکرا کر کہا تھا۔ ڈیکوریشن کا کام ابھی کچھ دن اور چلے گا بی چیک رکھ لو۔ کچھ پیسوں کی اور ضرورت ہوئی تو.....' اس نے محسوس کیا، ماتھر کی آنکھیں اس کے جسم پر چبھ رہی ہیں۔ ماتھر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھاما۔ 'میں چاہتا ہوں۔ اب یہیں تمہارے لیے ایک کمرہ بنا دوں۔ آفس کا کام یہیں سے سنبھال لو۔'

وہ مسکرائی تھی۔ کیوں نہیں سر۔ جیسا آپ کہیں۔'

اس دن وہ ماتھر کے کمرے میں تھی۔ برسات شروع ہوگئی تھی۔ پھر بارش تھم گئی۔ وہ کپڑے پہن کر باہر آئی تو ایک مجسمہ کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اتنے دنوں میں پہلی بار ماتھر کے جسم سے آنے والی بدبو کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس بدبو کا ساتھ بہت دنوں تک گوارہ نہیں کرسکتی تھی۔ اسے یقین تھا، ایک دن ماتھر اس کے ساتھ یہی کرنے والا ہے۔ وہ ماتھر سے ہاؤس ڈیکوریشن کے نام پر ایڈوانس چیک لے چکی تھی۔ چیک لیتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

لیکن اس درمیان وہ بہت کچھ فیصلہ اندر ہی اندر لے چکی تھی۔ آخر وہ انٹریرڈ یکوریٹر تھی۔ اس کے جسم پر کچھ پرائی انگلیوں کے داغ تھے تو یہاں کی دیواروں پر بھی اس کے ڈیکوریشن کی نشانیاں بھی موجود تھیں۔ اس نے نظر بھر کر آس پاس کے مجسموں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور باہر آگئی۔ باہر آنے کے بعد اس نے دیکھا۔ ماتھر کی بیوی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے کے بعد پورٹیکو کی طرف بڑھ رہی ہے بی اسے نفرت محسوس ہوئی۔ ایک زندہ لاش، جسے اس کے شوہر نے جیتے جی زندہ مجسمے میں تبدیل کردیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے فیصلہ لے رہی تھی۔

اس بار اس سے کوئی لاپرواہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماتھر کی کمپنی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے مجسمہ نہیں بننا تھا۔ اسے اب اپنے لیے بھی جینا تھا۔ ایک مدت سے وہ اپنی زندگی بھول چکی تھی۔ اب اس کو ایک نیا سفر شروع کرنا تھا۔ ابھی اس نئے سفر کے تمام اتار چڑھاؤ کے بارے میں غور کرنا تھا۔

گھر آنے کے بعد ایک خاص بات ہوئی۔ نیرج لافنگ بدھا کا ایک چھوٹا سا مجسمہ لے کر آیا تھا۔ مجسمہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نیرج نے کہا۔

'اچھا ہے نا؟ اس گھر کو مسکراہٹ کی ضرورت ہے۔' اس نے مجسمہ کو بے دردی سے زمین پر پٹخ دیا۔ مجسموں کی نہیں۔ مجھے زندگی کی ضرورت ہے۔'

زمین پر بے رحمی سے پٹخنے کے باوجود بھی لافنگ بدھا پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھل کر دیوار سے لگ گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا، گول مٹول سا لافنگ بدھا اس کی طرف ہی دیکھ رہا ہو۔ اور صرف دیکھ ہی نہیں رہا ہو، بلکہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ میں بھی اضافہ ہوگیا ہو۔

□□□

ٹوٹی ہوئی لڑیاں

نفیس انصاری
محلہ ڈیہہ پور، کھیری ٹاؤن، ضلع لکھیم پور کھیری
موبائل: 7379302972

ثنا کی امی کمرے سے سوٹ کیس اٹھالائیں اور اس میں رکھا ہوا سامان باہر نکالنے لگیں۔

'یہ رہے ساتوں سوٹ، یہ رہا لہنگا، یہ کرتی، یہ چنی، یہ رہا برقع، یہ میک اپ کا سامان اور یہ رہا نیک لیس۔'

نیک لیس کا کیس ہاتھ میں آنا تھا کہ انہیں غصہ آ گیا، بولیں۔

'کنجوس، مکھی چوس، کتنا ہلکا نیک لیس لائے تھے۔ ایک تولے سے بھی کم وزن کا۔'

ثنا کے ابو بول پڑے۔

'ثنا کی امی، وہ لوگ کنجوس و منحوس نہیں ہیں۔ بڑے چالاک قسم کے انسان ہیں۔ یہ سونے کا ہار ثنا کی مہر میں ہوتا نہ، اور مہر پر صرف لڑکی کا حق ہوتا ہے، اس لئے اتنا ہلکا بنوا کر لائے تھے۔ جن کی نیت میں کھوٹ ہوتی ہے، وہی ایسا کرتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ کوئی نااتفاقی ہو جائے، منگنی ٹوٹ جائے یا پھر طلاق ہو جائے، تو زیادہ نقصان نہیں ہوتا، ہار واپس ملا تو ملا، نہ ملا تو نہ سہی۔'

ثنا کے ابو نے تھوڑا دم لیا، پھر اپنے دوست ابرار حسین کو مخاطب کیا۔

'ابرار بھائی! یہ سامان اٹھا کر لے جایئے اور ان کم ظرفوں کے یہاں پہنچ آیئے۔'

ابرار حسین محو فکر تھے۔ کہاں انہیں ایک حج کا ثواب ملنے جا رہا تھا، اب کہاں وہ پچڑے میں پڑ گئے۔ شادی کرانا کوئی آسان کام ہے؟ نیکیاں بھی ملتی ہیں اور ذلت بھی، نپٹ جائے تو اچھا تو سیٹھ کی بڑی فضیحت۔

ثنا کے ابو پھر بولے۔

'ابرار بھائی کہاں کھو گئے؟ سامان اٹھایئے اور لے جایئے۔'

ابرار حسین چونک پڑے، پھر سامان سوٹ کیس میں پیک کرنے لگے۔

ثنا کے ابو کچھ یاد کرتے ہوئے پھر بولے۔

ثنا کی نند نے اسے لہنگا کرتی پہنایا، چنی اڑھائی، ماتھے پر ٹیکا، گلے میں نیک لیس، کانوں میں جھمکے اور ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ، ٹیکا اور جھمکے ثنا کی امی نے اس کے لئے جب تک بنوائے تھے، تاکہ کسی زیور کی کمی نہ رہے۔ اس کی سسرال سے آئیں تو ٹھیک نہ آئیں تو لڑکی سونی سونی نہ لگے۔

سامنے سنگاردان رکھا تھا۔ ثنا کی نظر اس پر پڑ گئی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اسے شرم آ گئی۔ آج وہ کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

'اور ہاں، انہوں نے یہ جو دس ہزار روپئے بھجوائے تھے، انہیں بھی لیتے جایئے، ان کے منہ پر مار دینا۔ بڑے غیر مند بنتے ہیں۔ ہمیں معاوضہ دے رہے ہیں۔ دس ہزار روپئے ہی خرچ ہوئے ہیں ہمارے، منگنی میں کم و بیش پچاس ہزار روپئے خرچ ہونے ہیں۔ ثنا کی امی بولیں، منگنی میں پورے پچاس لوگ آئے تھے۔ منگنی کیا پوری بارات تھی بھلا، ایسا کیا تھا جو ہم نے بنوایا نہ ہو۔ بریانی، قورمہ، کباب، کھیر اور شیر مال اوپر سے سبزی سوا لگ۔'

کمرے کا دروازہ پکڑے کھڑی ثنا سسک پڑی۔ اس کے گلابی مخملی گالوں پر آنسو موتیوں کے مانند لڑھک آئے۔ منگنی کے دن کتنی دھوم دھام تھی۔ اس کی ہونے والی ساس اور جٹھانی آئیں تھیں اور نند بھی۔ خاندان کی عورتیں بھی جمع تھیں، سبھی کو اس کی سسرال سے آیا سامان دکھایا گیا۔ کچھ نے تعریف کی، کچھ نہ منہ بنا دیا۔

'ہوں، اتنے نام والے بنتے ہیں اور اتنا کم سامان، کم سے کم گیارہ سوٹ تو ہوتے ہیں۔ خالی ہار اٹھا لائے وہ بھی پرانی بنت تھا۔ نہ جھمکے ہیں، نہ نتھ اور نہ ہی انگوٹھی۔'

ثنا کی نند نے اسے لہنگا کرتی پہنایا، چنی اڑھائی، ماتھے پر ٹیکا، گلے میں نیک لیس، کانوں میں جھمکے اور ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ، ٹیکا اور جھمکے ثنا کی امی نے اس کے لئے جب تک بنوائے تھے، تاکہ کسی زیور کی کمی نہ رہے۔ اس کی سسرال سے آئیں تو ٹھیک نہ آئیں تو لڑکی سونی سونی نہ لگے۔

سامنے سنگاردان رکھا تھا۔ ثنا کی نظر اس پر پڑ گئی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر اسے شرم آ گئی۔ آج وہ کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی امی اس کی بلائیں لینے لگیں۔ ساس اور نند کو پانی پسند پر فخر ہونے لگا، مگر جیٹھانی حسد سے جل بھن گئی۔ اس کا بس چلتے تو وہ یہ رشتہ ہونے ہی نہ دے۔

وہ گھر میں خود سے زیادہ خوبصورت عورت نہیں

چاہتی۔ اس کا مان جو کم ہو جائے گا، سبھی لوگ دیورانی کی تعریف کریں گے اور پھر یہ پڑھی لکھی بھی تو ہے، اس کی طرح انگوٹھا ٹیک تو نہیں۔

پھر اس دن سے ثنا کھلی کھلی رہنے لگی۔ صبح شام سجنے سنورنے لگی، منگنی میں آئے سوٹ پہن پہن کر دیکھنے لگی کہ کس سوٹ میں کیسی لگتی ہے۔ ہار بھی پہن کر دیکھتی، پھر خود ہی شرما جاتی۔

وہ خواب بھی دیکھنے لگی کہ اس کی بارات آرہی ہے۔ بڑی ہی دھوم دھام سے گاجے، باجے کے ساتھ۔ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے، بڑے سلیقے سے اس کا سنگار کیا گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی تو ایک دن پہلے ہی لگا دی گئی تھی۔ لہنگا، کرتی اور چنی میں وہ کسی حور سے کم نہیں لگ رہی ہے۔

کبھی وہ سوچتی کیسا ہے اس کا ہم سفر، موبائل کی ویڈیو کلپ میں تو بالکل فلمی ہیرو جیسا لگتا ہے۔ خوبصورت تو بہت ہے، اس کی سیرت کیسی ہے؟ تعلیم یافتہ ہے، سرکاری ملازمت کرتا ہے تو اس کی ذہنیت بھی اچھی ہی ہوگی۔ یہ ویڈیو کلپ ثنا کا چھوٹا بھائی بنا لایا تھا۔ ثنا اسی ویڈیو کلپ کو دیکھا کرتی تھی اور طرح طرح کی باتیں سوچا کرتی تھی۔

ادھر آفتاب یعنی ثنا کے منگیتر کا حال بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ منگنی والے دن جب ثنا کا بناؤ سنگار کیا گیا تھا تو اس کی نند نے بھی اس کی ویڈیو کلپ بنالی تھی اور جب سے آفتاب نے اس کلپ کو دیکھا تھا، بیتاب ہو اٹھا تھا۔ ثنا سے باتیں کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا مگر ثنا کو یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ آج کل کی لڑکیوں جیسی نہیں، جو حیا م شرم ہی نہ ہو البتہ جب ساس اور نند کے فون آتے، وہ سلام دعا کر لیا کرتی لیکن آفتاب سے .....نہ بابا نہ.....اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔

ایک دن جب وہ اپنی نند سے باتیں کر رہی تھی تو باتیں کرتے کرتے اس کی نند نے موبائل آفتاب کو پکڑا دیا تھا۔ کچھ دیر ثنا یوں ہی باتیں کرتی رہی، ساس اور جیٹھانی کی خیریت دریافت کرتی رہی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ ادھر اس کی نند نہیں کوئی اور ہے، اس نے کال کٹ کر دینی چاہی مگر آفتاب بول پڑا۔ پلیز ثنا، فون مت کاٹنا، تمہیں میری قسم۔

اتنا سننا تھا کہ ثنا کے ہوش وحواس گم ہو گئے۔ وہ کچھ بھی نہیں بول پائی آفتاب بولتا رہا۔ اس کے حسن و جمال کی تعریف کرتا رہا۔

پھر اس دن سے یہ سلسلہ ایسا چلا کہ دن ہو یا رات، صبح ہو یا شام دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے نہیں تھکتے۔ باتیں بھی کیا؟ ایک دوسرے کی پسند ناپسند کی۔ کون کون سے ہیرو ہیروئن پسند ہیں؟ فلمیں کیسی اچھی لگتی ہیں؟ ٹی وی سیریل کون کون سے دیکھتے ہیں؟ سہیلیاں کتنی ہیں اور بوائے فرینڈ کتنے ہیں۔

بوائے فرینڈ کے نام پر ثنا ناراض ہو جاتی، کہتی، سات بوائے فرینڈ ہیں میرے، شادی کرنی ہے تو کرو ورنہ رستہ پکڑو۔

آفتاب کو مزا آجاتا۔ وہ لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ پھر ثنا کو منانے لگتا اور اس کے بعد پیار محبت کا اظہار اور وعدے قسمیں ہونے لگتیں۔

اس طرح بہت ہی ہنسی خوشی دن گزر رہے تھے۔ اب تو بس شادی کا انتظار تھا۔ شادی بھی زیادہ دور نہ تھی۔ کم و بیش دو ماہ رہ گئے تھے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔

ایک دن ابرار حسین ثنا کے گھر تشریف لائے۔ وہ کچھ کچھ پریشان تھے۔ سلام دعا کے بعد ثنا کی امی نے پوچھا۔

'کیا بات ہے ابرار بھائی؟ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟'

'پریشان ہونے والی بات ہی ہے بھابی۔'

'ایسی کیا بات ہے؟'

ابرار حسین نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

'لڑکے نے موٹر سائیکل کی مانگ کی ہے۔'

ثنا کی امی کو ہنسی آگئی۔ 'بڑا نادان لڑکا ہے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟ کیا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ موٹر سائیکل بھی نہیں دیں گے۔'

شام کو جب ثنا کے ابو گھر لوٹے اور انہیں یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں بہت افسوس ہوا۔ بولے۔

'ثنا کی امی! لڑکے والے بہت لالچی لگ رہے ہیں۔ اللہ خیر کرے۔'

اور بات آئی گئی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ وقت گزرتا رہا۔ ادھر ایک بات اور ہوئی۔ آفتاب کا فون آنا بند ہو گیا۔ ثنا کو فکر ہوئی۔ آفتاب کی کال کیوں نہیں آتی؟ کیا وہ بیمار ہے؟ بیمار ہوتا تو پتہ چلتا۔ آخر کس کام میں مصروف ہے؟ ویسے تو دن ہو یا رات دم ہی نہیں لیتا تھا اور اب کتنے دن ہو گئے ہیں، اس سے بات کئے ہوئے!

آخر ثنا نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ پوری بیل گئی، ادھر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ دوبارہ ملایا۔ پھر نہیں ریسیو کی گئی۔ اس کے بعد فون بزی بتانے لگا۔

ثنا پر اداسی چھا گئی۔ وہ بار بار موبائل کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھتی۔ شاید اب آفتاب کا فون آئے۔ شاید اب، کبھی کبھی جب کسی اور کا یا پھر کمپنی کا فون آتا، وہ خوش ہو کر دوڑ پڑتی، اگلے ہی پل مایوس ہو کر رہ جاتی۔

آخر اس نے ایک ایس ایم ایس ٹائپ کیا۔ 'پلیز آفتاب، بات کرو۔ اتنا مت ستاؤ۔ تمہیں میری قسم' اور اسے آفتاب کے نمبر پر سینڈ کر دیا۔ کئی دن گزر گئے۔ ادھر سے نہ تو ایم ایم ایس آیا نہ ہی کال آئی۔

اسی اثنا ایک دن ابرار حسین کا آنا ہوا۔ آج پھر وہ کچھ پریشان سے تھے۔ پوچھنے پر بولے۔

'کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ لڑکے والوں کی منشاء کیا ہے؟'

ثنا کے ابو امی مضطربانہ نظروں سے ابرار حسین کا منھ تکنے لگے۔

ابرار حسین نے بتایا، 'لڑکے کی ماں کہہ رہی

تھیں کہ لڑکے کے رشتے اب بھی آرہے ہیں۔ ایک لڑکی والے تو فوروہیلر دینے کو تیار ہیں۔'

اتنا سننا تھا کہ ثنا کے ابو اٹھ کھڑے ہوئے۔ غصے سے کانپنے لگے۔

'ابرار بھائی! میں ان کے ہتھکڑیاں لگوا دوں گا۔ ان کا لالچ دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ ارے ان کا لڑکا سرکاری نوکری کرتا ہے، بینک میں ملازم ہے تو ہماری لڑکی بھی کوئی جاہل نہیں ہے۔'

ابرار بھائی سکتے میں آگئے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور ثنا کے ابو کو سمجھانے لگے،

'غفار بھائی، ٹھنڈے دماغ سے کام لیجئے، غصہ میں سب بگڑ جاتا ہے۔'

'کیا خاک ٹھنڈے دماغ سے کام لیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ سب کچھ بگڑ رہا ہے؟ وہ لوگ منگنی توڑنے کے موڈ میں ہیں، انہیں ہم سے موٹی مرغی مل گئی ہے۔'

'آپ ٹھیک فرما رہے ہیں، شاید انہیں سب سے اونچی پارٹی مل گئی ہے۔'

'تو کیا میں ایسی حالت میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا، جیل بھجوا دوں گا، انہیں، سمجھ کیا رکھا ہے!'

'غفار بھائی! ذرا سوچئے! اگر آپ نے ایسا کیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔'

'بدنامی؟ کس کی بدنامی؟'

'آپ کی؟ لوگ کہیں گے کہ لڑکی کا باپ ہوکر لڑکے والوں کو ہتھکڑی لگواتا ہے، جیل بھجواتا ہے، ثنا بیٹا کے لئے رشتے آنا بند ہو جائیں گے۔ لڑکی والوں کو بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔'

'تو کیا کیا جائے؟'

'اس سے پہلے کہ وہ منگنی توڑیں، ہم ان کے رشتے کو لات مار دیتے ہیں۔ اس سے وہ بدنام ہو جائیں گے کہ جہیز میں چار پہیا گاڑی مانگ رہے تھے۔ انہیں رشتہ ڈھونڈے نہیں ملے گا۔ ہماری ثنا بٹیا کے لئے ہزاروں رشتے آئیں گے۔ آخر اس میں کمی کیا ہے؟ خوبصورت ہے اور خوب سیرت بھی، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہوئی ہے!'

'پھر ایک دن لڑکے والوں کی طرف سے تین چار معزز لوگ آئے۔ ان لوگوں میں ان کے یہاں کی

مسجد کے پیش امام صاحب بھی تھے اور ابرار حسین بھی۔ بیٹھ کر طے پایا کہ فریقین ایک دوسرے کا سامان واپس کر دیں اور لڑکی والے کے کھانے دانے میں جو خرچ ہوا ہے، اس کا معاوضہ لڑکے والے دیں۔'

ثنا کی امی کمرے کے اندر سے بولیں۔

'دکھائی میں ہم لوگ لڑکے کو سونے کی انگوٹھی پہنا آئے تھے اور پانچ ہزار روپئے نقد بھی دئے تھے۔ مٹھائی اور پھل بھی لے گئے تھے، سوا لگ۔'

'یہی کہا جارہا ہے کہ جو بھی لیا دیا ہے، وہ ایک دوسرے کو واپس کر دیں۔ مٹھائی کھٹائی اور پھل فروٹ تو لڑکے والے بھی لائے ہوں گے؟' پیش امام صاحب بولے۔

ثنا کی امی بولیں، 'وہ ٹھہرے لڑکے والے! وہ بھلا کیوں لانے لگے مٹھائی اور پھل فروٹ، بٹیا کو دو سو روپئے پکڑا گئے تھے بس۔'

آج ابرار حسین وہ سارا سامان جو لڑکے کے یہاں سے آیا تھا، لینے آئے تھے اور ساتھ میں پندرہ ہزار روپئے بھی لائے تھے۔ دس ہزار معاوضہ کے اور پانچ ہزار وہ جو لڑکی والے لڑکے کو دے آئے تھے۔ ہاں، سونے کی انگوٹھی بھی لائے تھے۔

ابرار حسین جب سوٹ کیس اٹھا کر چلنے لگے تو ثنا بولی، 'انکل! ایک چیز رہ گئی ہے، وہ بھی لیتے جایئے۔'

'وہ کیا بیٹی؟' جلدی سے لے آیئے۔

'انکل آپ سوٹ کیس مجھے دے دیجئے، میں اسی میں رکھ دوں گی۔' ثنا نے سوٹ کیس لیتے ہوئے کہا۔

ثنا کی امی کو بڑی حیرت تھی کہ ایسی کیا چیز رہ گئی۔ میں نے تو سب کچھ چیک کر لیا تھا۔

ثنا کمرے کے اندر گئی، سوٹ کیس بیڈ پر رکھا اور قینچی اٹھائی۔

شام کو جب سوٹ کیس آفتاب کے گھر پہنچا تو گھر کی عورتیں جلدی سے اسے کھول کر دیکھنے لگیں کہ سارے کپڑے، میک اپ کا سامان اور نیک لیس ہے یا نہیں۔

سوٹ تو سارے دکھائی پڑ رہے ہیں، برقع بھی ہے، لہنگا، کرتی اور چنی بھی ہے، بچا کھچا میک اپ کا سامان بھی لیکن یہ کیا، آفتاب کی بھابی چیخ پڑیں۔ 'یہ لہنگا تو کٹا ہوا ہے!'

دوبارہ دیکھا گیا، حقیقت میں لہنگا چاک چاک تھا، فوراً کرتی اٹھا کر دیکھی گئی، وہ بھی کئی جگہ سے چاک تھی، سارے کے سارے لباس اٹھا اٹھا کر دیکھے گئے۔ سب کے سب تار تار نکلے۔ نقاب کا بھی یہی حال تھا۔

جلدی سے نیک لیس اٹھا کر دیکھا گیا۔ اس کی بھی لڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔

□□□

امرا و شرفا کی مشترک خصوصیات

مرزا جعفر حسین
۱۸۹۹ ۱۹۸۹

امرا اور شرفا میں مالی اعتبار سے نمایاں فرق ہونے کے باوصف ان کے ذوق اور مذاق میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت تھی۔ بہت سی خصوصیات، مثلاً شستگی، شائستگی، تہذیب، اخلاق، انسان دوستی، عالی ہمتی اور شرافت نفس، ان دونوں طبقوں میں مماثل اور مشترک تھے۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ انہیں خصائل حمیدہ کی بدولت لکھنؤ کی پرانی معاشرت کو شہرتِ دوام کا شرف حاصل ہوا اور جس کی کوئی نظیر ہندوستان تو درکنار دنیا کے کسی ملک میں پیش نہیں ہوسکی۔ اس شہر میں امیر ہوں یا غریب، سب ہی کو دوسروں کے احساسات کا لحاظ رہتا تھا اور کوئی بھی کسی کو خواہ وہ مقابلتاً کم حیثیت ہی کیوں نہ ہو، شکایت کا موقع عمداً نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ رکھ رکھاؤ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو سہل معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقتاً بہت مشکل امر تھا کیونکہ وہ دور نازک مزاجیوں کا تھا۔ قریب قریب ہر شہری نازک مزاج تھا، اس لئے امرا ہوں یا شرفا، سب اپنی ملاقاتوں میں تہذیب و ادب کے تمام پہلو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ملاقات کے لئے کوئی دوست، عزیز اور معزز شہری آجاتا ہو اسی کے شایان شان خیر مقدم ہوتا تھا۔

رئیسوں کے درباروں میں مستقل آنے والوں کو کوئی نہ کوئی معینہ شرف حاصل رہتا تھا لیکن مخصوص لوگوں میں کسی کی آمد پر رؤسا اپنی جگہ سے کچھ بلند ہوکر کسی کے واسطے نصف قامت سے کھڑے ہوکر اور بعض عمائدین کے لئے سروقد آداب تکریم بجالاتے تھے۔ شرفا کے یہاں ان کے عزیز، دوست اور دوسرے لوگ ملنے کے لئے برابر آیا کرتے تھے۔ ان مواقع پر بھی بجنسہ اسی ادب و تہذیب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی تقریب وغیرہ کے موقع پر شرفا کے یہاں کوئی بلند پایہ رئیس آجاتا تو وہ گھروں سے باہر نکل کر اس کا استقبال کرتے۔ شہزادگان بالخصوص وہ صاحبان عزت و جلال جن کا سلسلۂ نسب براہ راست شاہان اودھ سے ملتا تھا اور زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق تھے۔ ان کے لئے احترام کے آداب و رسوم بھی مخصوص تھے جن کو بڑے سے بڑا رئیس بخوشی خاطر بجا لاتا تھا اور اس بجا آوری میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اس سلسلہ میں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے جو اس زمانہ سے متعلق ہے جب ہمارا پرانا کلچر دم توڑ رہا تھا اور نئی قدریں پرانی عمارتوں کو مسمار کرکے اپنے لئے نیا مقام تعمیر کرنے پر آمادہ ہوچکی تھیں۔

جانِ عالم واجد علی شاہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے پرنس افسر الملوک انتزاعِ سلطنت کے بعد پہلی اور آخری مرتبہ لکھنؤ تشریف لاتے تھے۔ ان کی آمد کی خبر سن کر شارا شہر اشتیاق دید میں ابل پڑا تھا۔ بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں جن میں رؤسا و عمائدین کے علاوہ اعلیٰ سرکاری عہدے دار اور ہائی کورٹ کے جج شامل تھے۔ ان کے استقبال کے لئے بغیر کسی دعوت یا خواستگاری کے اسٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ پلیٹ فارم پر پنجاب میل کے آتے ہی راجہ محمد امیر احمد خاں مرحوم والی محمود آباد نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور مودبانہ جھک کر سات مرتبہ تسلیمیں کیں۔ پھر پرنس

'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'

۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔

پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کمھلانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہو گیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل جو جھتا رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔

'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'

اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی کے طور پر مرزا جعفر حسین کی کتاب 'قدیم لکھنؤ کی آخری بہار' سے ایک تحریر 'امرا و شرفا کی مشترک خصوصیات' حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔

(ایڈیٹر)

بہادر کے ہمراہ رکاب محمود آباد ہاؤس قیصر باغ گئے۔ وہاں پہنچ کر بالا خانہ پر ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں پرنس کو کچھ وقفے کے لئے سکون حاصل کرنا تھا۔ یہاں ایک مزین صوفے پر پرنس تشریف فرما ہوئے۔ اس صوفے سے متصل دونوں جانب بہت سی کرسیاں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں لیکن ان پر کوئی رئیس یا بزرگ نہیں بیٹھا۔ زمین پر دری اور قالین کا فرش تھا۔ اسی فرش پر لکھنؤ کے بڑے بڑے رئیس، ممتاز معززین، افسران اعلیٰ، ہائی کورٹ کے جج اور خود راجہ محمود آباد بھی بیٹھ اور اسی کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ یہ تھا وہ استقبال اور وہ اکرام جو سابق بادشاہ کے فرزند کو پیش کیا گیا تھا۔ راقم نے کلکتہ میں انہیں راجہ صاحب کے والد بزرگوار مہاراجہ سر محمد علی محمد خاں مرحوم کو بھی بجنسہ اسی طرح پرنس افسر الملوک کا احترام کرتے دیکھا تھا۔ انہوں نے بھی سات تسلیمیں بجالا کر زمین کے فرش ہی پر بیٹھ جانا پسند فرمایا تھا اور پرنس کے حضور یا برابر کسی کرسی پر بیٹھنے کی جسارت نہیں فرمائی تھی۔

یہ واقعہ بہرحال سب سے زیادہ جلیل القدر شخصیت کے متعلق تھا لیکن ادب و تہذیب لکھنؤ والوں کے ضمیر میں شامل تھے۔ وہ حسب مراتب دوسروں کا احترام کرتے اور ملاقات ہوتے ہی مراسم بجا لاتے تھے۔ اودھ کے حکمران عقیدتاً مسلمان اور نسلاً ایرانی تھے لیکن تہذیب و معاشرت کی انہوں نے تعمیر کی تھی وہ نہ عربی تھی اور نہ ایرانی۔ اس کو ہم خاص لکھنوی کلچر ہی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے مسلمان ملکوں نیز ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں مسلمان 'السلام علیکم' یا 'سلامٌ علیکم' کہہ کر ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ میں خود اپنی زبان میں سلام کرنے کا چلن رائج ہوا اور 'آداب'، 'تسلیم'، 'تسلیمات'، 'بندگی'، 'کورنش'، 'مجرا' یہ الفاظ 'عرض ہے'، 'بجا لاتا ہوں' کے ساتھ مستعمل تھے۔ اول الذکر تینوں الفاظ اب تک رائج ہیں۔ باقی طور طریقے متروک ہو گئے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرہ ہی ختم ہو گیا جہاں ہر ہر موقع اور محل پر علیٰحدہ علیٰحدہ طرز سے سلام کرنے کا رواج تھا مثلاً یہ کہ 'کورنش' ادبی صحبتوں اور مشاعروں میں داد پانے پر شعراء اور ادیب بجالاتے تھے۔ 'مجرا' عرض کرنے کی اصطلاح رئیسوں کے درباروں میں مستعمل تھی۔ 'بندگی' بھی ملازمین اپنے آقاؤں کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ سلام کرنے میں بھی مراتب کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور ان مدارج کا تعین دولت و ثروت کی فراوانی، علم و فضل میں کمال اور بسا اوقات پاکبازی کے ساتھ کبرسنی کی بنیادوں پر ہوا کرتا تھا۔ یہی طور طریقے جواب سلام کے بھی تھے۔ شرعاً نیز اخلاقاً جواب سلام واجب ہے۔ لکھنؤ والے بھی جوابِ سلام میں تامل نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کی بڑے بڑے رئیس اپنے چھوٹے سے چھوٹے درجہ کے ملازم کو بھی اس کے مودبانہ آداب و تسلیمات کا جواب دست بہ سر ہو کر اور زبان سے سلام، سلام کہہ کر دیا کرتے تھے۔ اپنے سے عمر میں چھوٹوں کو ان کے سلام کا جواب دعاؤں کے الفاظ میں دیا جاتا تھا۔ مثلاً 'زندہ رہو'، 'سلامت رہو'، 'خوش رہو'، 'عمر دراز ہو'، 'صاحب اقبال ہو'

ہر ملاقات میں سلام کے بعد مزاج پرسی بھی تہذیب میں داخل تھی۔ اس مزاج پرسی کے لئے بھی کوئی ایک لفظ یا ایک اصطلاح معین نہیں تھی بلکہ متعدد فقرے رائج تھے۔ مثلاً 'مزاج شریف'، 'مزاج مبارک'، 'مزاج اقدس'، 'مزاج عالی'، 'مزاج مقدس'، 'مزاج معلیٰ'، 'مزاج گرامی' وغیرہ وغیرہ اور ان سب کے استعمال کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ مراتب تھے۔ شرفا، بے تکلف دوستوں سے 'مزاج شریف' یا 'مزاج مبارک' کہتے تھے۔ رئیسوں سے ان کے درباروں میں 'مزاج مقدس' یا 'مزاج گرامی' یا 'مزاج عالی' کہہ کر مزاج پرسی ہوتی تھی۔ علمائے کرام کے حضور 'مزاج عالی' یا 'مزاج معلیٰ' مستعمل تھا۔ امراء و رؤسا بھی اپنے اپنے مقربین، مصاحبین اور ملازمین کی مزاج پرسی کرتے تھے۔ ان کا انداز یہ تھا۔ 'کہئے سب خیریت ہے'، 'مزاج اچھا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ معاشرت میں اس تمام رکھ رکھاؤ کی بدولت ایک طرف تو ہماری پرانی تہذیب بکھر رہی تھی تو دوسری طرف اردو زبان پر صیقل ہو رہی تھی اور اس کے خزینے میں بیش بہا الفاظ و فقرات سے اضافہ ہوتا رہتا تھا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایک ہی موقع و محل پر استعمال ہونے والے الفاظ کی، صرف مراتب کی بنیاد پر امتیازی تقسیم میں بہتات کا شرف اردو زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں ہوا۔ استخبار مزاج کا جواب بھی فرض عین ہوتا ہے لہٰذا جواب میں صرف یہ کہا جاتا تھا کہ 'شکر ہے'، 'اچھا ہوں'، 'الحمدللہ'، 'آپ کی عنایت'، 'خیریت ہے' وغیرہ وغیرہ۔ پہلا فقرہ امراء و رؤسا خاموشی سے گردن جھکا کر اپنے ملازمین وغیرہ کی مزاج پرسی کے جواب میں فرما دیتے تھے۔ دوسرا فقرہ بے تکلف دوستوں میں رائج تھا۔ تیسرا عام طور پر مستعمل تھا۔ باقی دونوں اور کچھ اور فقرے شرفاء، موقع و محل سے جواب میں کہا کرتے تھے۔

طرزِ تکلم اور آداب نشست و برخاست کا تذکرہ بھی اسی مقام پر ضروری ہے۔ امراء و شرفا اپنے طرزِ تکلم میں شستگی و شائستگی کے ساتھ مخاطب کے مدارج اور اس سے اپنے روابط کا خیال رکھتے اور ادب و تہذیب کے تمام فروعات ملحوظ رکھتے تھے۔ بڑے سے بڑا رئیس اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ خادم سے 'تو' کر کے بات نہیں کرتا تھا۔ مخصوص ملازمین میں کسی سے اگر کبھی 'تم' کہہ کر بات کر لی تو اس کو کسی مخصوص قدردانی یا مہربانی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ امرا و شرفا اپنے روزمرہ میں ہر آدمی سے، خواہ وہ کم درجہ ہی کا کیوں نہ ہو 'آپ' کر کے بات کرتے تھے۔ اپنی جوان اولاد اور دوسرے عزیزوں سے جو رشتے میں چھوٹے ہوتے، 'آپ' ہی کہہ کر تخاطب کرتے تھے۔ رؤسا و امرا و زعما

کے درباروں نیز شرفا کی خاص صحبتوں میں ہمیشہ احتراماً مکالمہ ہوتا اور بغیر کسی مخصوص تعظیمی لفظ یا فقرہ کو زبان سے ادا کئے تخاطب نہیں ہوتا تھا۔ ایسے الفاظ یا فقرے جناب، جناب عالی، جناب والا، قبلہ، قبلہ و کعبہ، حضرت، سرکار، حضور، حضور والا، حضرت والا، حضور عالی وغیرہ مستعمل تھے لیکن عام طور سے ان کا محل استعمال جدا جدا تھا۔ مثل قبلہ اور قبلہ و کعبہ صاحبان علم اور علمائے کرام کے لئے مخصوص تھا۔ قبلہ عموماً والد بزرگوار یا کسی دوسرے رشتہ کے بزرگ کو کہتے تھے۔ حضور، سرکار، حضور والا، حضور عالی کہہ کر اپنے آقائے ولی نعمت کو مخاطب کرتے تھے۔ ان مواقع پر محل استعمال کے اعتبار سے اور بہت سے دوسرے فقرات بھی رائج تھے مثلاً عالی مرتبت، ولی نعمت، فیض گنجور وغیرہ وغیرہ۔ جناب، جناب عالی اور جناب والاعلیٰ قدر مراتب احباب و اعزا کے لئے تخاطب میں مخصوص فقرات تھے۔ لکھنؤ والوں کو پاس ادب کا اتنا خیال رہتا تھا کہ اجنبی آدمیوں سے بھی 'آپ' اور 'جناب' کے بغیر بات نہیں کرتے تھے۔

جلیل القدر رئیسوں کے درباروں میں مستقل آنے والوں کے لئے بیٹھنے کی جگہ متعین تھی۔ شرفاء کی نشست گاہوں مین بھی آنے والے وضعداریوں کے تحت اپنی اپنی جگہ اختیار کر لیتے تھے۔ صاحب دربار یا مالک خانہ صدر مقام پر بیٹھتا تھا۔ درباروں میں رئیس کے داہنی جانب دوست، احباب اور ہم عصر رؤسا تشریف فرما ہوتے تھے اور بائیں جانب مقربین و ملازمین اور صاحبان حاجت بیٹھا کرتے تھے۔ رئیس سے کسی کو کوئی بات راز میں کہنا ہوتی یا کسی خاص موضوع پر گفتگو کرنا ہوتی تو وہ باجازت سامنے آجاتا اور بالمقابل بیٹھ کر گفتگو کرتا تھا۔ شرفا کے یہاں ایسی کوئی امتیازی شان نہیں ہوتی تھی لیکن ہر بزم میں زور سے بات کرنا یا دوسرے کی آواز پر جواب میں اپنی آواز بلند کر دینا آداب محفل کے منافی تھا۔ نشست میں بھی مراتب ملحوظ رکھنا بہت زیادہ ضروری تھا۔ یہ مراتب عہدہ و منصب، ثروت و وقار اور عمر میں خوردگی و بزرگی کے تناسب سے پرکھے جاتے تھے۔ انہیں مدارج کی بنا پر پیش و پس کی تفریق ہوتی تھی۔ کمسن لوگوں کا بزرگواروں کے برابر، آگے یا ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا شدت کے ساتھ ناقابل عفو گناہ تھا۔ یہ ایسی تقصیر تھی جس پر خطاکار کو خفگی و ناراضگی کی سزا بھی بھگتنی پڑتی تھی۔ آداب نشست و برخاست میں یہ بھی ضروری تھا کہ جو جس طرح آگے بیٹھا ہے، اسی طرح بیٹھا رہے۔ کسی خاص مجبوری میں اور معذرت خواہی کے ساتھ پہلو بدلا جا سکتا تھا۔ اسی طرح اجازت لئے بغیر بزم سے اٹھ جانا بہت معیوب تھا۔ آمد و رفت میں یا کسی فعل و عمل کے وقت ایک کا دوسرے پر پیش قدمی کرنا بھی خلاف تہذیب تھا اور برابر والوں سے بھی یہی رکھ رکھاؤ برتا جاتا تھا۔ چنانچہ ایسے مواقع پر 'پہلے آپ، پہلے آپ' کہنے کا افسانہ زبانزد خلائق ہے۔ زمانہ کی گرم رفتاری نے رنگ بدلا تو پہلے آپ پہلے آپ کا فقرہ مقام طنز و مزاح میں باقی رہ گیا لیکن تہذیب و شرافت کی وہ حسین و دلکش عمارت جو اس کے پس پشت تعمیر تھی، مسمار ہو گئی۔

امرا و شرفاء کی نشستوں میں سود و سودا یا دنیاداری کی باتیں نہیں ہوتی تھیں، اپنے گھر کے مالی حالات یا اشیاء و اجناس کی قیمتوں کے تذکرے کرنا شرمناک حد تک معیوب تھا۔ عام طور سے شعر و ادب یا دنیاوی معاملات میں بے نیازانہ ہلکی پھلکی باتیں ہوتی تھیں۔ البتہ زبان و بیان کے حسن و قبح پر سختی سے نظر رہتی تھی۔ سلاست و روانی اور فصاحت و بلاغت میں حرف آتا تو بلا تکلف ایک دوسرے کو ٹوک دیتے تھے۔ ضلع جگت میں مکالمہ چھڑ جاتا تو گھنٹوں کے لئے فراغت ہو جاتی تھی۔ افسانوی رنگ میں شہر کے آئے دن آنے والے واقعات پر تذکرے ہوتے تھے لیکن اس طرح کہ ہر افسانہ حقیقت بن جاتا تھا۔ افسانہ گو خود بھی اس واقعہ کو صحیح سمجھتا اور حقیقت کیط رح پیش کرتا تھا۔ یہ لوگ امیر ہوں یا غریب بالعموم خوش گفتار اور صادق القول تھے۔ جھوٹ بولا بھی جاتا تو اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ دروغ بیانی از خود واضح ہو جاتی تھی اور یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ دروغ گو کا منشاء ہی مزاح اور تفنن طبع تھا۔ مختصر یہ کہ ہمارے پرانے شہری خود بھی سچ بولتے تھے اور دوسروں کو بھی سچا سمجھتے تھے۔ یہ خصلت اتنی پائیدار تھی کہ ان کی نشستوں میں مہمل سا مہمل اور ناقابل فہم افسانہ بھی کم سے کم وقتی طور پر باور کر لیا جاتا تھا کیونکہ وہ یہ سوچنے کو بھی تیار نہیں ہوتے تھے کہ ان کا کوئی عزیز یا دوست ان سے جھوت بھی بول سکتا ہے۔ بہت پرانے طرز کے رئیسوں میں ایسے رجحانات اور زیادہ تھے کیونکہ وہ کسی کو جھوٹا کہنے یا سمجھنے کو خلاف تہذیب قرار دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

مشہور شاعر اور ادیب فصاحتؔ مرحوم متعدد شہزادگان اور رئیسوں بالخصوص نوابان شیش محل کے درباروں پہ پابندی اوقات حاضر باشی کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے ہمارے ہم درس اور بے تکلف دوست تھے۔ وہ بچپن ہی سے خوش مزاج اور تیز طبع تھے۔ ایک مرتبہ ہماری ٹولی چپ تعزیہ میں شرکت کرتی ہوئی چوک سے گزر رہی تھی۔ کثیر مجمع تھا۔ اکبری دروازہ پار کرتے ہوئے جہاں مٹی کے کھلونے کی دکانیں آراستہ تھیں، کسی کی کہنی کا دھکا لگ کر ایک ہاتھ گر کر کچل گیا۔ واپسی پر جب ہم لوگ گھر پہنچے تو فصاحت مرحوم نے اپنے صاحبزادے سے مجمع کا حال دریافت کیا۔ انہوں نے طفلانہ شرارت میں مبالغہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ 'ابا اتنا جم غفیر تھا کہ ایک ہاتھی کچل گیا'۔

فصاحت مرحوم بیحد خفقانی تھے۔ دن بھر ہاتھی کچل جانے کا تصور بندھا رہا۔ شام کو گولہ گنج میں نواب ابو صاحب کے یہاں انہوں نے اس افسانے کو حقیقت

بنا کر پیش کیا جس کو سب نے باور کر لیا۔ دوسرے روز صبح کو شیش محل کے دربار میں انہوں نے یہی روایت بیان کی۔ فصاحت مرحوم ہمہ وقت تسبیح بکف رہتے اور بہت زیادہ خوش گفتار تھے۔ ان کی عمر اس وقت ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ غرض کہ اس دربار میں بھی یہ حکایت حقیقت بن گئی اور یہ خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ قریب قریب ہر رئیس کے دربار میں یہی چرچا ہوتا رہا کہ ہاتھ کچل گیا۔ غالباً دو تین روز کے بعد میری ملاقات مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں مرحوم سے ہوئی اور اس افسانہ کا تذکرہ انہوں نے مجھ سے فرمایا، تب میں نے ان کو اصل واقعہ سنایا اور پھر ان کے دربار سے اس واقعہ کی تردید ہوئی اور حقیقت لوگوں تک پہنچی مگر دو تین روز تک اس غلط بیانی کی بدولت محفلوں میں گرما گرمی ہو رہی تھی۔

رؤسا، شرفا بلکہ شہر لکھنؤ سے قریب قریب سب باشندے انگریزی حکومت سے اتنا زیادہ خائف تھے کہ پولیس کے کانسٹیبل یا کچہری کے مذکوری کو بھی دیکھ کر گھبرا جاتے تھے۔ بعض مقتدر عمائدین کے تعلقات حکامان بالا سے ضرور تھے اور ان کو حکومت میں وقار بھی حاصل تھا لیکن شرفاء کچہری کا ذکر سن کر کانپ جاتے تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب رؤسا و شرفا قرض کی لعنت میں گرفتار ہو چکے تھے اور ان کے خلاف بڑے بڑے سود سمیت دعوے ہونے لگے تھے تو وہ پیروی مقدمہ کے مقابلہ میں یک طرفہ ڈگری ہو جانا گوارا کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں ایک محترم بزرگ کے حاضر عدالت ہونے کا واقعہ قابل ذکر ہے جو اس صدی کی تیسری دہائی میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یہ بزرگ وثیقہ دار تھے اور والد مرحوم سے تعلقات کی بنا پر ان کو چچا کہتا تھا۔ ان کے خلاف عدالت خفیفہ میں تخمیناً پانچ سو روپے کا دعویٰ ہوا تھا، وہ فرماتے تھے کہ انہوں نے صرف پچاس روپے قرض لئے تھے اور مہاجن نے بڑھا چڑھا کر دعویٰ کیا تھا۔ میں وکالت کے پیشہ میں داخل ہو چکا تھا۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ تاریخ پیشی پر خود آئیں اور پیروی مقدمہ میرے حوالے کر دیں۔ میں نے ان کو یہ بھی باور کرایا کہ جج خفیفہ عبدالحق صاحب بہت معقول آدمی تھے لیکن پھر بھی وہ بدقت کچہری آنے پر آمادہ ہوئے اور آئے بھی تو اس طرح کہ ایک ہاتھ میں تسبیح تھی جس پر وہ مسلسل دعائیں اور

آیات قرآنی پڑھتے رہے تھے۔ مقدمہ کی پکار ہونے پر جسم میں لرزہ پڑ گیا اور تلاوت میں اور تیزی آ گئی۔ عدالت نے پہلا سوال کیا۔ نواب صاحب! آپ مدعی کے قرضدار ہیں؟ وہ زبان سے جواب نہیں دے سکے اور اپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر سر ہلا دیا۔ جس کے معنی تھے 'جی ہاں! گلے گلے پانی میں' پھر عدالت نے کہا اس کا دعویٰ ہے، کیا آپ کو تسلیم ہے؟ اب میں نے ان سے کہا کہ تسبیح ہاتھ سے رکھئے اور زبان سے جواب دیجئے۔ تب انہوں نے وہی سب کچھ کہا جو مجھ سے کہہ چکے تھے۔ عدالت نے طرح طرح سے مدعی کو سمجھایا، اس سے جرح بھی کی، بالآخر تین سو روپیہ مجموعی رقم کی ڈگری بالاقساط صادر ہونا قرار پا گیا۔ عدالت نے کہا: بیس روپئے ماہوار قسط سے ادا کر دیجئے۔ اب انہوں نے بے قرار ہو کر کہا: 'نا بابا! مر جاؤں گا، بابا مر جاؤں گا۔' پیشکار نے اس جواب پر ان کو ڈانٹا تو عدالت نے اس کو روکا اور فرمایا کہ یہ قدیم لکھنؤ کی تہذیب اور زبان ہے۔ آپ نہ بولئے، میں مزے لے رہا ہوں۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اپنی آمدنی اور خرچ کی مدات صفائی اور دیانت داری سے بیان کر دئے اور پندرہ روپئے ماہوار قسط طے پا گئی۔ ان مدات اخراجات میں ان کے مرغ اور کبوتروں کے علاوہ افیون کا خرچ بھی شامل تھا۔ میرے علم و یقین میں یہ واحد مقدمہ تیسری دہائی تک ایسا تھا جس میں قدیم لکھنؤ کے ایک ممتاز پرانے طرز کے شہری کی موجودگی میں پیروی مقدمہ ہوئی تھی۔

وہ دور بہرحال ختم ہوا، موجودہ زمانے میں جب کہ سود و سودا کی ہر طرف گرم بازاری ہے، نہ ویسے لوگوں کی سماج کو ضرورت ہے اور نہ وہ پرانی قدریں نئی معاشرت میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اور ہو کر رہا لیکن افسوس اس کا ہے کہ پرانے لوگوں اور ان کے طرزِ زندگی کے مٹ جانے کے بعد وہ گرانقدر خوبیاں بھی خاک میں مل گئیں جو شرفائے لکھنؤ کے لئے سرمایۂ افتخار تھیں یعنی متانت و سنجیدگی، خوش اطواری و خوش کرداری، صداقت و راست بازی، اخوت و محبت، مہر و وفا، رافت و الفت، تہذیب و اخلاق، نفاست و لطافت اور سب سے بڑھ کر رواداری اور جذباتی ہم آہنگی۔ آج ہم فرقہ وارانہ یک جہتی کے جتنے نعرے بھی بلند کریں لیکن پہلی سی وہ بات کہاں۔ جب اختلاف مذہب و ملت کے باوصف دلوں میں کدورت نہیں تھی اور نہ منافرت کا کوئی شائبہ ہمارے کرداروں میں تھا۔ یہی تھا لکھنؤ کا وہ اصل معاشرہ جس پر آج بھی پرانے شہریوں کو بجا طور پر فخر ہے۔

❑❑❑

واپسی

اوشا پریمودا
ہینڈرسن، ویٹاکری-0610، آکلینڈ
(نیوزی لینڈ)

گجادھر بابو نے کمرے میں جمع سامان پر ایک نظر دوڑائی۔ دو بکس، ڈولچی، بالٹی-'یہ ڈبا کیسا ہے، گنیش؟' انہوں نے پوچھا۔ گنیشی بستر باندھتا ہوا، کچھ فکر، کچھ دکھ، کچھ لجا سے بولا، گھر والی نے ساتھ کو کچھ بیسن کے لڈو رکھ دیئے ہیں۔ کہا، بابو جی کو پسند تھے۔ اب کہاں ہم غریب لوگ، آپ کی کچھ خاطر کر پائیں گے۔' گھر جانے کی خوشی میں بھی گجادھر بابو نے ایک افسوس کا احساس کیا، جیسے، ایک واقف کار، پیار، عزت سے، آسان دنیا سے ان کا رشتہ توٹ رہا ہو۔

'کبھی کبھی ہم لوگوں کی بھی خبر لیتے رہیئے گا۔' گنیشی بستر میں رسی باندھتا ہوا بولا۔

'کبھی کچھ ضرورت ہو تو لکھنا گنیشی! اس اگہن تک بٹیا کی شادی کر دو۔'

گنیشی نے انگوچھے کے چھور سے آنکھیں پوچھیں، 'اب آپ لوگ سہارا نہ دیں گے، تو کون دے گا؟ آپ یہاں رہتے تو شادی میں کچھ حوصلہ رہتا۔'

گجادھر بابو چلنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ریلوے کوارٹر کا یہ کمرہ، جس میں انہوں نے کتنے سال بتائے تھے، ان کا سامان ہٹ جانے سے بدشکل اور ننگا لگ رہا تھا۔ آنگن میں لگائے پودے بھی جان پہچان کے لوگ لے گئے تھے، اور جگہ جگہ مٹی بکھری ہوئی تھی۔ پر بیوی، بال بچوں کے ساتھ رہنے کے تصور میں یہ جدائی ایک پتلی لہر کی طرح اٹھ کر پوشیدہ ہو گئی۔

گجادھر بابو خوش تھے، بہت خوش۔ پینتیس سال کی نوکری کے بعد وہ ریٹائر ہو کر جا رہے تھے۔ ان سالوں میں زیادہ تر وقت انہوں نے اکیلے رہ کر کاٹا تھا۔ ان اکیلے پلوں میں انہوں نے اسی وقت کا تصور کیا تھا، جب وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہ سکیں گے۔ اسی امید کے سہارے وہ اپنی کمی کا بوجھ ڈھو رہے تھے۔ دنیا کی نظر میں انکی زندگی کامیاب کہی جا سکتی تھی۔ انہوں نے شہر میں ایک مکان بنوالیا تھا۔ بڑے لڑکے امر اور لڑکی کانتی کی شادیاں کر دی تھیں، دو بچے اونچی درجات میں پڑھ رہے تھے۔ گجادھر بابو نوکری کی وجہ سے اکثر چھوٹے اسٹیشنوں پر رہے اور ان کے بچے اور بیوی شہر میں، جس سے پڑھائی میں رکاوٹ نہ ہو۔ گجادھر بابو مزاج سے بہت دوست انسان تھے اور دوستی کے تمنائی بھی۔ جب کنبہ ساتھ تھا، ڈیوٹی سے لوٹ کر بچوں سے ہنستے۔ بولتے، بیوی سے کچھ ہنسی مذاق کرتے ان سب کے چلے جانے سے ان کی زندگی میں گہرا سونا پن بھر اٹھا۔ خالی پلوں میں ان سے گھر میں ٹکا نہ جاتا۔ شاعر فطرت کے نہ ہونے پر بھی انہیں بیوی کی پیار بھری باتیں یاد آتی رہتیں۔ دوپہر میں گرمی ہونے پر بھی، دو بجے تک آگ جلائے رہتیں اور ان کے اسٹیشن سے واپس آنے پر گرم گرم روٹیاں سینکتی.....ان کے کھا چکنے اور منع کرنے پر بھی تھوڑا سا کچھ اور تھالی میں پروس دیتی، اور بڑے پیار سے اصرار کرتی۔ جب وہ تھکے۔ ہارے باہر سے آتے، تو ان کی آہٹ پا وہ رسوئی کے دروازے پر نکل آتی اور ان کی حیادار آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ گجادھر بابو کو تب ہر چھوٹی بات بھی یاد آتی اور وہ مایوس ہو اٹھتے.....اب کتنے سالوں بعد وہ موقع آیا تھا، جب وہ پھر اسی پیار اور محبت کے درمیان رہنے جا رہے تھے۔

ٹوپی اتار کر گجادھر بابو نے چارپائی پر رکھ دی، جوتے کھول کر نیچے کھسکا دیئے، اندر سے رہ رہ کر قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ اتوار کا دن تھا اور ان کے سب بچے اکٹھے ہو کر ناشتہ کر رہے تھے۔ گجادھر بابو کے سوکھے چہرے پر۔ ہلکی مسکان آ گئی، اسی طرح مسکراتے ہوئے وہ بغیر کھانسے اندر چلے آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ نریندر کمر پر ہاتھ رکھے شاید گزشتہ شب کی فلم میں دیکھے گئے کسی رقص کی نقل کر رہا تھا اور بسنتی ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ امر کی بہو کو اپنے

اوشا پریمودا ہندی کی مقبول قلمکار ہیں۔ ان کی درجنوں ناول اور افسانوں کے مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ 'پچپن کھمبے لال دیواریں' ان کا مشہور ناول ہے جس پر ٹی وی سیریل بھی بنا۔ ان کا وطن کانپور ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد انہوں نے کچھ دن لیڈی شری رام کالج میں تدریس کے فرائض انجام دئے۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلی گئیں۔ وہاں انہوں نے پوسٹ ڈاکٹورل تحقیق کی اور اس کے بعد امریکہ کی وسکانسن یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئیں۔ ان کی کہانیوں کے کرداروں میں چھٹی اور ساتویں دہائی کے ہندوستانی شہری کنبوں کے جذبات، شہروں میں بڑھتی اداسی اور تنہائی نظر آتی ہے۔ ان کی کئی کہانیوں کے ترجمے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کی مشہور کہانی 'واپسی' کا ترجمہ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کیا ہے۔

تن ۔بدن، آنچل یا گھونگھٹ کا کوئی ہوش نہ تھا اور وہ کھلے طور سے ہنس رہی تھی ۔ گجادھر بابو کو دیکھتے ہی نریندر دھپ سے بیٹھ گیا اور چائے کا پیالہ اٹھا کر منھ سے لگا لیا۔ بہو کو ہوش آیا اور اس نے جھٹ سے ماتھا ڈھک لیا، صرف بسنتی کا جسم رہ رہ کر ہنسی دبانے کی کوشش میں ہلتا رہا۔

گجادھر بابو نے مسکراتے ہوئے ان لوگوں کو دیکھا ۔پھر کہا، 'کیوں نریندر ، کیا نقل ہو رہی ہے؟'

'کچھ نہیں بابو جی!' نریندر نے سٹ پٹا کر کہا۔ گجادھر بابو نے چاہا تھا کہ وہ بھی اس دلبستگی میں حصہ لیتے ،مگر ان کے آتے ہی جیسے سب پریشان کند ہو کر چپ ہو گئے ۔اس سے ان کے دل میں تھوڑی سی مایوسی پیدا ہو گئی ۔ بیٹھتے ہوئے بولے، 'بسنتی ، چائے مجھے بھی دینا۔ تمہاری اماں کی پوجا ابھی چل رہی ہے کیا؟'

بسنتی نے ماں کی کوٹھری کی جانب دیکھا، 'ابھی آتی ہی ہوں گی'، اور پیالے میں ان کیلئے چائے چھاننے لگی۔ بہو چپ چاپ پہلے ہی چلی گئی تھی، اب نریندر بھی چائے کا آخری گھونٹ پی کر اٹھ کھڑا ہوا، صرف بسنتی ، والد کے لحاظ میں، چوکے میں بیٹھی ماں کی راہ دیکھنے لگی۔ گجادھر بابو نے ایک گھونٹ چائے پی ، پھر کہا، 'بنّی ۔چائے تو پھیکی ہے۔'

'لائیے، چینی اور ڈال دوں۔' بسنتی بولی۔

'رہنے دو، تمہاری اماں جب آئے گی، تبھی پی لوں گا۔'

'تھوڑی دیر میں ان کی بیوی ہاتھ میں ادھر یہ کا لوٹا لیئے نکلی اور ادھوری ثنا کہتے ہوئے تلسی میں ڈال دیا۔ انہیں دیکھتے ہی بسنتی بھی اٹھ گئی۔ بیوی نے آکر گجادھر بابو کو دیکھا اور کہا، 'ارے ،آپ اکیلے بیٹھے ہیں۔یہ سب کہاں گئے؟' گجادھر بابو کے دل میں پھانس سی کرک اٹھی، 'اپنے اپنے کام میں لگ گئے ہیں۔آخر بچے ہی ہیں۔'

بیوی آکر چوکے میں بیٹھ گئی، انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر چاروں جانب جھوٹھے برتنوں کو دیکھا۔ پھر کہا، 'سارے میں جھوٹھے برتن پڑے ہیں۔اس گھر میں دھرم ۔کرم کچھ نہیں ۔ پوجا کر کے سیدھے چوکے میں گھسو۔' پھر انہوں نے نوکر کو پکارا، جب جواب نہ ملا تو ایک بار اور اونچی آواز میں، پھر شوہر کی جانب دیکھ کر بولیں، 'بہو نے بھیجا ہوگا بازار۔' اور ایک لمبی سانس لے کر چپ ہو رہیں۔

گجادھر بابو بیٹھ کر چائے اور ناشتے کا انتظار کرتے رہے۔ انہیں اچانک ہی گنیشی کی یاد آ گئی۔ روز صبح ،پنجر آنے سے پہلے وہ گرم گرم پوریاں اور جلیبی بناتا تھا۔ گجادھر بابو جب تک اٹھ کر تیار ہوتے، ان کے لئے جلیبیاں اور چائے لا کر رکھ دیتا تھا۔ چائے بھی کتنی بڑھیا، کانچ کے گلاس میں اوپر تک بھری لبالب، پورے ڈھائی چمچ شکر اور گاڑھی ملائی ۔ پنجر بھلے ہی رانی پور لیٹ پہنچے، گنیشی نے چائے پہنچانے میں کبھی دیر نہیں کی۔کیا مجال کہ کبھی اس سے کچھ کہنا پڑے۔

بیوی کی شکایت بھری آواز سن کر ان کے خیالات میں رکاوٹ پہنچی وہ کہہ رہی تھیں، 'سارا دن اسی کھیچ کھیچ میں نکل جاتا ہے ۔اسی گرہستی کا دھندا پیٹتے ۔پیٹتے عمر گزر گئی۔کوئی زرا ہاتھ بھی نہیں بٹاتا۔'

'بہو کیا کیا کرتی ہے؟' گجادھر بابو نے پوچھا۔

'پڑی رہتی ہے۔بسنتی کو تو، پھر کہو کہ کالج جانا ہوتا ہے۔'

'گجادھر بابو نے جوش میں آکر بسنتی کو آواز دی۔بسنتی بھابھی کے کمرے سے نکلی تو گجادھر بابو نے کہا، 'بسنتی ، آج سے شام کا کھانا بنانے کی ذمہ داری تم پر ہے۔صبح کا کھانا تمہاری بھابھی بنائے گی۔'

بسنتی منھ لٹکا کر بولی، 'بابو جی، پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔'

گجادھر بابو نے پیار سے سمجھایا، 'تم صبح پڑھ لیا کرو۔تمہاری ماں بوڑھی ہوئی، ان کے جسم میں اب وہ طاقت نہیں بچی ہے۔تم ہو، تمہاری بھابھی ہیں، دونوں کو مل کر کام میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔'

بسنتی چپ رہ گئی۔اس کے جانے کے بعد اس کی ماں نے دھیرے سے کہا، 'پڑھنے کا تو بہانہ ہے۔کبھی جی ہی نہیں لگتا ۔لگے کیسے؟ شیلا سے ہی فرصت نہیں، بڑے بڑے لڑکے ہیں ان کے گھر میں، ہر وقت وہاں گھسا رہنا، مجھے نہیں اچھا لگتا۔منع کروں تو سنتی نہیں۔'

ناشتہ کر کے گجادھر بابو میٹنگ میں چلے گئے۔ گھر چھوٹا تھا اور ایسا انتظام ہو چکا تھا کہ اس میں گجادھر بابو کے رہنے کیلئے کوئی مقام نہ بچا تھا۔ جیسے کسی مہمان کیلئے کچھ عارضی انتظام کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح میٹنگ میں کرسیوں کو دیوار سے سٹا کر بیچ میں گجادھر بابو کیلئے پتلی سی چارپائی ڈال دی گئی تھی۔ گجادھر بابو اس کمرے میں پڑے پڑے، کبھی کبھی اچانک ہی، اس غیر مستقلی کا احساس کرنے لگتے ۔انہیں یاد ہو آتی ان

ریل گاڑیوں کی، جو آتی اور تھوڑی دیر رک کر کسی اور نشانہ کی جانب چلی جاتیں۔

گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے بیٹھک میں ہی اب اپنا انتظام کیا تھا۔ ان کی بیوی کے پاس اندر ایک چھوٹا کمرہ ضرور تھا، مگر وہ ایک جانب اچاروں کے مرتبان کے، دال، چاول کے کنستر اور گھی کے ڈبوں سے گھرا تھا، دوسری جانب پرانی رزائیاں، دریوں میں لپٹی اور رسی سے بندھی رکھی تھیں، اس کے پاس ایک بڑے سے ٹین کے بکس میں گھر بھر کے گرم کپڑے تھے۔ درمیان میں ایک الگنی بندھی ہوئی تھی، جس پر اکثر بسنتی کے کپڑے لاپرواہی سے پڑے رہتے تھے۔ وہ اکثر اس کمرے میں نہیں جانتے تھے۔ گھر کا دوسرا کمرہ امرا اور اس کی بہو کے پاس تھا، تیسرا کمرہ، جو سامنے کی جانب تھا، بیٹھک تھا۔ گجادھر بابو کے آنے سے پہلے اس میں امر کی سسرال سے آیا بینت کی تین کرسیوں کا سیٹ پڑا ہوا تھا، کرسیوں پر نیلی گدیاں اور بہو کے ہاتھوں کے کڑھے کشن تھے۔

جب کبھی ان کی بیوی کو کوئی لمبی شکایت کرنی ہوتی، تو اپنی چٹائی بیٹھک میں ڈال کر بیٹھ جاتی تھیں۔ وہ ایک دن چٹائی لے کر آ گئیں۔ گجادھر بابو نے گھر گھرستی کی باتیں چھیڑیں، وہ گھر کا رویہ دیکھ رہے تھے۔ بہت ہلکے سے انہوں نے کہا کہ اب ہاتھ میں پیسہ کم رہے گا، کچھ خرچ کم ہونا چاہئے۔

'سبھی خرچ تو واجب ہیں، کس کا پیٹ کاٹوں؟ یہی جوڑ گانٹھ کرتے کرتے بوڑھی ہوگئی، نہ من کا پہنا، نہ اُوڑھا۔'

گجادھر بابو نے دکھی اور مایوس نظر سے بیوی کو دیکھا۔ ان سے اپنی حیثیت چھپی نہ تھی۔ ان کی بیوی تنگی کا احساس کر کے اس کا ذکر کرتیں۔ یہ فطری تھا، لیکن ان میں ہمدردی کی پوری کمی گجادھر بابو کو بہت کھٹکی۔ ان سے اگر رائے لی جاتی کہ انتظام کیسے ہو، تو انہیں فکر کم، اطمینان زیادہ ہوتا۔ لیکن ان سے تو صرف شکایت کی جاتی تھی، جیسے کنبہ کی سب پریشانیوں کیلئے وہی ذمہ دار تھے۔

تمہیں کس بات کی کمی ہے امر کی ماں۔ گھر میں بہو ہے، لڑکے بچے ہیں، صرف روپئے سے ہی آدمی امیر نہیں ہوتا' گجادھر بابو نے کہا اور کہنے کے ساتھ ہی محسوس کیا۔ یہ ان کے اندرونی جذبات تھے۔ ایسی کہ ان کی بیوی نہیں سمجھ سکتیں۔ 'ہاں، بڑا سکھ ہے نا بہو سے۔ آج رسوئی کرنے گئی ہے، دیکھو کیا ہوتا ہے؟' کہہ کر بیوی نے آنکھیں بند کیں اور سو گئیں۔

گجادھر بابو بیٹھے ہوئے بیوی کو دیکھتے رہ گئے۔ یہی تھی کیا ان کی بیوی، جس کے ہاتھوں کے نرم و نازک احساس، جس کی مسکراہٹ کی یاد میں انہوں نے پوری زندگی کاٹ دی تھی؟ انہیں لگا کہ حسن سے بھرپور نوجوان لڑکی زندگی کی راہ میں کہیں کھو گئی ہے اور اس کی جگہ آج جو عورت ہے، وہ ان کے دل اور سانسوں کیلئے بے حد اجنبی ہے۔ گاڑھی نیند میں ڈوبی ان کی بیوی کا بھاری جسم بہت بے ڈول اور بدصورت لگ رہا تھا، چہرہ بے نور اور روکھا تھا۔ گجادھر بابو دیر تک یکسوئی نظر سے بیوی کو دیکھتے رہے اور پھر لیٹ کر چھت کی جانب دیکھنے لگے۔

اندر کچھ گرا اور ان کی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، 'لو بلی نے کچھ گرا دیا شاید' اور وہ اندر بھاگیں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ کر آئیں تو انکا منھ پھولا ہوا تھا، 'دیکھا بہو کو، چوکا کھلا چھوڑ آئی، بلّی نے دال کی پتیلی گرا دی۔ سبھی تو کھانے کو ہیں، اب کیا کھلاؤں گی؟' وہ سانس لینے کو رکیں اور بولیں، 'ایک ترکاری اور چار پراٹھے بنانے میں سارا ڈبا گھی اڑیل کر رکھ دیا۔ زرا سا درد نہیں ہے، کمانے والا ہاڑ توڑے اور یہاں چیزیں لوٹیں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ یہ سب کام کسی کے بس کا نہیں ہے۔'

گجادھر بابو کو لگا کہ بیوی کچھ اور بولے گی تو ان کے کان جھنجھنا اٹھیں گے۔ اونٹھ بھینچ، کروٹ لے کر انہوں نے بیوی کی جانب پیٹھ کر لی۔

رات کا کھانا بسنتی نے جان بوجھ کر ایسا بنایا تھا کہ نوالہ تک نگلا نا جا سکے۔ گجادھر بابو چپ چاپ کھا کر اٹھ گئے، مگر نریندر تھالی سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، 'میں ایسا کھانا نہیں کھا سکتا۔'

بسنتی تنک کر بولی، 'تو نا کھاؤ، کون تمہاری خوشامد کرتا ہے۔'

تم سے کھانا بنانے کو کہا کسنے تھا؟' نریندر چلّایا۔

'بابو جی نے۔'

بابو جی کو بیٹھے بیٹھے یہی سوجھتا ہے۔'

بسنتی کو اٹھا کر ماں نے نریندر کو منایا اور اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلایا۔ گجادھر بابو نے بعد میں بیوی سے کہا، 'اتنی بڑی لڑکی ہوگئی اور اسے کھانا بنانے تک کا شعور نہیں آیا!'

'ارے، آتا تو سب کچھ ہے، کرنا نہیں چاہتی۔' بیوی نے جواب دیا۔ اگلی شام ماں کو رسوئی میں دیکھ، کپڑے بدل کر بسنتی باہر آئی، تو بیٹھک سے گجادھر بابو نے ٹوک دیا، 'کہاں جا رہی ہو؟'

'پڑوس میں، شیلا کے گھر۔' بسنتی نے کہا۔

'کوئی ضرورت نہیں ہے، اندر جا کر پڑھو۔' گجادھر بابو نے سخت لہجے میں کہا۔ کچھ دیر غیر یقینی طور پر کھڑے رہ کر بسنتی اندر چلی گئی۔ گجادھر بابو شام کو روز ٹہلنے چلے جاتے تھے، لوٹ کر آئے تو بیوی

> بیوی نے صاف صاف جواب نہیں دیا۔ امرا اور اس کی بہو کی شکایتیں بہت تھیں۔ انکا کہنا تھا کہ گجادھر بابو ہمیشہ بیٹھک میں ہی پڑے رہتے ہیں، کوی آنے جانے والا ہو تو کہیں بٹھانے کی جگہ نہیں۔ امر کو اب بھی وہ چھوٹا سا سمجھتے تھے اور موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے۔ بہو کو کام کرنا پڑتا تھا اور ساس جب تب پھوہڑ پن پر تانے دیتی رہتی تھیں۔ 'ہمارے آنے سے پہلے بھی کبھی ایسی بات ہوئی تھی؟' گجادھر بابو نے پوچھا۔ بیوی نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں۔ پہلے امر گھر کا مالک بن کر رہتا تھا، بہو کو کوئی روک ٹوک نہ تھی، امر کے دوستوں کا اکثر یہیں اڈا جمع رہتا تھا۔

نے کہا، 'کیا کہہ دیا بسنتی سے؟ شام سے منھ لپیٹے پڑی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھایا۔'

گجادھر بابو دکھی ہو گئے۔ بیوی کی بات کا انہوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ انہوں نے دل میں ارادہ کرلیا کہ بسنتی کی شادی جلدی ہی کر دینا ہے۔ اس دن کے بعد بسنتی والد سے بچی بچی رہنے لگی۔ جانا ہوتا تو پچھواڑے سے جاتی۔ گجادھر بابو نے دوایک بار بیوی سے پوچھا تو جواب ملا، 'روٹھی ہوئی ہے۔' گجادھر بابو کو غصہ آیا۔ لڑکی کے اتنے مجاز، جانے کو روک دیا تو والد سے بولے گی نہیں۔ پھر ان کی بیوی نے ہی اطلاع دی کہ امر الگ رہنے کی سوچ رہا ہے۔

'کیوں؟' گجادھر بابو نے حیران ہوکر پوچھا۔

بیوی نے صاف صاف جواب نہیں دیا۔ امر اور اس کی بہو کی شکایتیں بہت تھیں۔ انکا کہنا تھا کہ گجادھر بابو ہمیشہ بیٹھک میں ہی پڑے رہتے ہیں، کوی آنے جانے والا ہو تو کہیں بٹھانے کی جگہ نہیں۔ امر کو اب بھی وہ چھوٹا سا سمجھتے تھے اور موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے۔ بہو کو کام کرنا پڑتا تھا اور ساس جب تب پھوہڑپن پر تانے دیتی رہتی تھیں۔ 'ہمارے آنے سے پہلے بھی کبھی ایسی بات ہوئی تھی؟' گجادھر بابو نے پوچھا۔ بیوی نے سر ہلا کر بتایا کہ نہیں۔ پہلے امر گھر کا مالک بن کر رہتا تھا، بہو کو کوئی روک ٹوک نہ تھی، امر کے دوستوں کا اکثر یہیں اڈا جمع رہتا تھا اور اندر سے ناشتا چائے تیار ہوکر جاتا رہتا تھا۔ بسنتی کو بھی وہی اچھا لگتا تھا۔

گجادھر بابو نے بہت آہستہ سے کہا، 'امر سے کہو، جلد بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'

اگلے دن وہ صبح گھوم کر لوٹے تو انہوں نے پایا کہ بیٹھک میں ان کی چارپائی نہیں ہے۔ اندر جاکر پوچھنے ہی والے تھے کہ ان کی نظر رسوئی کے اندر بیٹھی بیوی پر پڑی۔ انہوں نے یہ کہنے کو منھ کھولا کہ بہو کہاں ہے، مگر کچھ یاد کر کے چپ ہو گئے۔ بیوی کی کوٹھری میں جھانکا تو اچار رضائیاں اور کنستروں کے درمیان اپنی چارپائی لگی پائی۔ گجادھر بابو نے کوٹ اتارا اور کہیں ٹانگنے کو دیوار پر نظر ڈوڑائی۔ پھر اسے موڑ کر الگنی کے کچھ کپڑے کھسکا کر، ایک کنارے ٹانگ دیا۔ کچھ کھائے بغیر ہی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ کچھ بھی ہو، تن بدن آخر کار بوڑھا ہی تھا۔ صبح شام کچھ دور ٹہلنے ضرور چلے جاتے، مگر آتے جاتے تھک جاتے تھے۔ گجادھر بابو کو اپنا بڑا سا کوارٹر یاد آ گیا۔ بے فکر زندگی، صبح پسنجر ٹرین آنے پر اسٹیشن کی چہل قدمی، جان

پہچان والے چہرے اور پٹری پر ریل کے پہیوں کی کھٹ کھٹ، جوان کیلئے میٹھی موسیقی کی طرح تھی۔ طوفان اور ڈاک گاڑی کے انجنوں کی چنگھاڑ ان کی اکیلی راتوں کی ساتھی تھی۔ سیٹھ رام جی مل کے مل کے کچھ لوگ کبھی کبھی پاس آ بیٹھتے، وہی ان کا دائرہ تھا، وہی ان کے ساتھی۔ وہ زندگی اب انہیں ایک کھویا ہوا فنڈ سا محسوس ہوا۔ انہیں لگا کہ وہ زندگی کے ذریعہ ٹھگے گئے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا، اس میں سے انہیں ایک بوند بھی نا ملی۔

لیٹے ہوئے وہ گھر کے اندر سے آتی ہوئی مختلف آوازوں کو سنتے رہے۔ بہو اور ساس کی چھوٹی سی جھڑپ، بالٹی پر کھلے نل کی آواز، رسوئی کے برتنوں کی کھٹ پٹ اور اسی میں دو گوریئوں کی گفتگو۔ اور اچانک ہی انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب گھر کی کسی بات میں دخل نا دیں گے۔ اگر گھر کے مالک کیلئے پورے گھر میں ایک چارپائی کی جگہ نہیں ہے، تو یہیں پڑے رہیں گے۔ اگر کہیں اور ڈال دی گئی تو وہاں چلے جائیں گے۔ اگر بچوں کی زندگی میں ان کیلئے کہیں مقام نہیں، تو اپنے ہی گھر میں پردیسی کی طرح پڑے رہیں گے.....اور اس دن کے بعد سچ مچ گجادھر بابو کچھ نہیں بولے۔ نریندر روپئے مانگنے آیا تو بغیر وجہ پوچھے اسے روپئے دے دیئے۔ بسنتی کافی اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی پڑوس میں رہی تو بھی انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ مگر انہیں سب سے بڑا غم یہ تھا کہ ان کی بیوی نے بھی ان میں کچھ تبدیلی نشان نہیں کیا۔ وہ دل ہی دل کتنا وزن ڈھو رہے ہیں، اس سے وہ انجان ہی بنی رہیں۔ بلکہ انہیں شوہر کے گھر کے معاملے میں مداخلت نا کرنے کی وجہ شانتی ہی تھی۔ کبھی کبھی کہہ بھی اٹھتی 'ٹھیک ہی ہے، آپ بیچ میں نا پڑا کیجئے، بچے بڑے ہو گئے ہیں، ہمارا جو فرض/ڈیوٹی تھا، کر رہے ہیں۔ پڑھا رہے ہیں، شادی کر دیں گے۔'

گجادھر بابو نے دکھی نظر سے بیوی کو دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ بیوی اور بچوں کیلئے صرف رقم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جس شخص کے وجود سے بیوی مانگ میں سندور ڈالنے کی حقدار ہے، سماج میں اس کی عزت ہے، اس کے سامنے وہ دو وقت کھانے کی تھالی رکھ دینے سے سارے فرائض سے چھٹی پا جاتی ہے۔ وہ گھی اور شکر کے ڈبوں میں اتنی رمی ہوئی ہے کہ اب وہی اس کی پوری دنیا بن گئے ہے۔ گجادھر بابو ان کی زندگی کے مرکز نہیں ہو سکتے، انہیں تو اب بیٹی کی شادی کیلئے بھی جذبہ بجھ گیا۔ کسی بات میں مداخلت نہ کرنے کے ارادے کے بعد بھی ان کا وجود اس ماحول کا ایک حصہ نہ بن سکا۔ ان کی موجودگی

اس گھر میں ایسی غیر مناسب لگنے لگی تھی، جیسے سجی ہوائی بیٹھک میں ان کی چارپائی تھی۔ ان کی ساری خوشی ایک گہری مایوسی میں ڈوب گئی۔

اتنے سب ارادوں/عزائم کے باوجود بھی ایک دن بیچ میں دخل دے بیٹھے۔ بیوی اپنے مزاج کے مطابق نوکر کی شکایت کر رہی تھیں، 'کتنا کام چور ہے، بازار کی بھی چیز میں پیسہ بناتا ہے، کھانے بیٹھتا ہے، تو کھاتا ہی چلا جاتا ہے۔' گجادھر بابو کو برابر یہ محسوس ہوتا رہتا تھا کہ ان کے گھر کا رہن سہن اور خرچ ان کی حیثیت سے کہیں زیادہ ہے۔ بیوی کی بات سن کر کہتے کہ نوکر کا خرچ بالکل بے کار ہے۔ چھوٹا موٹا کام ہے، گھر میں تین مرد ہیں، کوئی نہ کوئی کر ہی دے گا۔ انہوں نے اسی دن نوکر کا حساب کر دیا۔ امر دفتر سے آیا تو نوکر کو پکارنے لگا۔ امر کی بہو بولی، 'بابو جی نے نوکر چھڑا دیا ہے۔'

'کیوں؟'

'کہتے ہیں خرچ بہت ہے۔'

یہ بات چیت بہت سیدھی سی تھی، مگر جس ٹون میں بہو بولی، گجادھر بابو کو کھٹک گیا۔ اس دن جی بھاری ہونے کی وجہ سے گجادھر بابو ٹہلنے نہیں گئے تھے۔ کاہلی میں اٹھ کر ہتی بھی نہیں جلائی تھی۔ اس بات سے بے خبر نریندر ماں سے کہنے لگا، 'اماں، تم بابو جی سے کہتی کیوں نہیں؟ بیٹھے بٹھائے کچھ نہیں تو نوکر ہی چھڑا دیا۔ اگر بابو جی یہ سمجھیں کہ میں سائیکل پر گیہوں رکھ کر آٹا پسانے جاؤں گا، تو مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔' 'ہاں اماں'، بسنتی کی آواز تھی، 'میں کالج بھی جاؤں اور لوٹ کر گھر میں جھاڑو بھی لگاؤں، یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔'

'بوڑھے آدمی ہیں'، امر بھن بھنایا، 'چپ چاپ پڑے رہیں۔ ہر چیز میں دخل کیوں دیتے ہیں؟' بیوی نے بڑے طنزیہ انداز سے کہا، 'اور کچھ نہیں سوجھا، تو تمہاری بہو کو ہی چوکے میں بھیج دیا۔ وہ گئی تو پندرہ دن کا راشن پانچ دن میں بنا کر رکھ دیا۔' بہو کچھ کہے، اس سے پہلے وہ چوکے میں گھس گئی۔ کچھ دیر میں اپنی کوٹھری میں آئی اور بجلی جلائی تو گجادھر بابو کو لیٹے دیکھ بڑی سٹ پٹائی۔ گجادھر بابو کے منہ کے تاثرات سے وہ ان میں

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیا دور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیا دور سے براہ راست یا بذریعہ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰ روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیا دور'

جذبات کا اندازہ نہ لگا سکی۔ وہ چپ آنکھیں بند کئے لیٹے رہے۔

گجادھر بابو چٹھی ہاتھ میں لیئے اندر آئے اور بیوی کو پکارا۔ وہ بھیگے ہاتھ لیئے نکلیں اور آنچل سے پونچھتی ہوئی پاس آ کھڑی ہوئیں۔ گجادھر بابو نے بغیر کسی تمہید کے کہا، 'مجھے سیٹھ رام جی مل کی شکر مل میں نوکری مل گئی ہے۔ خالی بیٹھے رہنے سے تو چار پیسے گھر میں آئیں، وہی اچھا ہے۔ انہوں نے تو پہلے ہی کہا تھا، میں نے ہی منع کر دیا تھا۔' پھر کچھ رک کر، جیسے بجھی ہوئی آگ میں ایک چنگاری چمک اٹھے، انہوں نے دھیمی آواز میں کہا، 'میں نے سوچا تھا کہ برسوں تم سب سے الگ رہنے کے بعد، ریٹائر ہو کر گھر والوں کے ساتھ رہوں گا۔ خیر، پرسوں جانا ہے۔ تم بھی چلو گی؟' 'میں؟' بیوی نے سکپکا کر کہا، 'میں چلوں گی تو یہاں کا کیا ہوگا؟ اتنی بڑی گرہستی، پھر سیانی / جوان لڑکی.....'

بات بیچ میں کاٹ کر گجادھر بابو نے مایوسی بھری آواز میں کہا، 'ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔' اور گہری خاموشی میں ڈوب گئے۔

نریندر نے بڑی مستعدی سے بستر باندھا اور رکشہ بلا لایا۔ گجادھر بابو کا ٹین کا بکس اور پتلا سا بستر اس پر رکھ دیا گیا۔ ناشتے کے کیلئے لڈو اور مٹھری کی ڈلیہ ہاتھ میں لیئے گجادھر بابو رکشہ پر بیٹھ گئے۔ نظر انہوں نے اپنے گھر والوں پر ڈالی۔ پھر دوسری اور دیکھنے لگے اور رکشہ چل پڑا۔

ان کے جانے کے بعد سب اندر لوٹ آئے۔ بہو نے امر سے پوچھا۔ 'سنیما لے چلئے گا نا؟' بسنتی نے اچھل کر کہا، 'بھیا، ہمیں بھی۔'

گجادھر بابو کی بیوی سیدھے چوکے میں چلی گئی۔ بچی ہوئی مٹھریوں کو کٹور دان میں رکھ کر اپنے کمرے میں لائی اور کنستروں کے پاس رکھ دیا، پھر باہر آ کر کہا، 'ارے نریندر، بابو کی چارپائی کمرے سے نکال دے۔ اس میں چلنے تک کی جگہ نہیں ہے۔'

❑❑❑

ایندھن

حمید دلوائی
۱۹۳۲ ۱۹۷۷

حامد عمر دلوائی مراٹھی زبان کے مقبول ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے مراٹھی زبان میں کئی ناول لکھے۔ مراٹھی کے علاوہ ان کی انگریزی میں بھی کچھ کتابوں شائع ہو چکی ہیں۔ مراٹھی اور انگریزی زبان پر انہیں یکساں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مبنی ان کی کئی کتابیں مراٹھی زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بحیثیت صحافی اپنے کیریئر کی شروعات کی تھی۔ وہ سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انڈین سوشلسٹ پارٹی کے نمایاں لیڈر کے طور پر بھی انہوں نے اپنی شناخت قائم کی۔ اپنی محض ۴۴ سالہ زندگی کا کافی بڑا عرصہ انہوں نے مسلم طبقہ بالخصوص مسلم عورتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے میں صرف کیا۔

اردو کے ادبی رسالوں میں عام طور پر روسی، انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کی تصنیفات نظر آجاتی ہیں لیکن اردو ہندی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کے تراجم شائع کرنے کا رواج ذرا کم ہے۔ ہماری کوشش رہے گی کہ 'نیا دور' کے ہر شمارے میں ہندوستانی زبانوں کے نمائندہ ادب پاروں کے ترجمے پیش کئے جائیں۔ اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی کے طور پر مراٹھی زبان کے مشہور ادیب حمید دلوائی کے ناول 'ایندھن' کی تیسری قسط شائع کی جارہی ہے۔

(ایڈیٹر)

لیکن ایک دن اس نے مجھ سے سوال کیا، 'سمتی کیا کہتی ہے؟'

اس کے لہجے کا طنز مجھے نہ بھایا۔ میں نے کہا، 'کیا کہے گی؟'

'پھر اتنی رات تک آپ لوگ کیا بات کرتے رہتے ہیں؟'

'کچھ خاص نہیں، وہ بلا لیتی ہے، میں چلا جاتا ہوں۔'

'بس؟'

'ہاں، بس اتنا ہی۔'

'کیا آپ اسے آپ کے بھائی سے بہتر نہیں لگتے؟' اس نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

'کس لحاظ سے؟' اس کا مطلب بھانپتے ہوئے میں نے پوچھا۔

'ہر لحاظ سے، کیوں؟ اس میں کوئی غلط بات ہے؟'

'ہاں، بالکل غلط ہے۔' میں نے کہہ۔ 'میرے وہاں جانے کا یہ مطلب نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔'

'لیکن وہ کیا کہتی ہے، یہ آپ نے بتایا نہیں۔ کیونکہ آج کل وہ آپ کے بھائی سے نہیں ملتی۔'

'تو ٹھیک ہے نا؟' میں نے کہا۔

'لیکن اس واسطے آپ وہاں رات بھر بیٹھے رہیں، یہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'

'مجھے بھائی جیسا مت سمجھنا۔'

'میں نہیں سمجھتی۔ وہ کم از کم خود کو مسلمان تو مانتے ہیں۔ آپ تو یہ بھی نہیں مانتے۔ اگر آپ کے جی میں آئی تو اس سے رشتہ جوڑ کے بیٹھ جائیں گے، اس کا ڈر لگتا ہے۔'

'اس کی فکر مت کرو۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔'

میں نے اسے ہنس کر جواب دیا تھا لیکن مجھے لگا کہ اس کے دل کا شک دور نہیں ہوا۔ اس نے پہلی بار میری بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔

بھابی کی بات سے ایک بار پھر میرے پرسکون ذہن میں لہریں اٹھنے لگیں۔ میں سمتی کے خیال کو جھٹک دینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس سے ملنا بند کر دیا۔ اب ٹھنڈ کا زور کم ہو گیا تھا اس لئے میں نے پچھواڑے کے آنگن میں بیٹھنا بھی ترک کر دیا۔ شاید وہ بہت بار سڑک سے گزرتے ہوئے اس طرف نگاہ ڈالتی ہوگی اور میرے نہ دکھائی دینے کی وجہ سے آگے چلی جاتی ہوگی۔ یہ میں جانتا تھا۔ لیکن اتنے دنوں میں وہ ہمارے گھر بالکل نہیں آئی۔

اور پھر ایک دن شام کے وقت اس سے میری ملاقات ہوگئی۔ میں سڑک پر گھومتا ہوا بازار کی طرف گیا اور نالے کی پلیا پر بیٹھا تھا۔ دن ڈھل چکا تھا اور ہر طرف کہرا چھاتا جا رہا تھا۔ بازار سے گاؤں کی طرف آنے والے لوگوں کی قطار بندھی ہوئی تھی۔ میں پلیا پر بیٹھا ان کی ہلچل دیکھ رہا تھا۔

وہ کب آئی، میں نے نہیں دیکھا۔ جب وہ میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی تب میرا دھیان اس کی طرف گیا۔ وہ بازار سے لوٹ رہی تھی۔ اس کے

ہاتھوں میں سامان کی تھیلی تھی۔ اس نے اسے ہلکے ہاتھ سے پلیا کی مینڈ پر رکھ دیا اور تھکے ہوئے انداز میں کھڑی رہی۔

اس وقت وہ مجھے غیر معمولی طور پر حسین لگی۔ اس نے سادہ سی، استری کی ہوئی سفید ساڑی پہن رکھی تھی اور ڈھیلے بندھے ہوئے جوڑے پر گجرا لپیٹ رکھا تھا۔ ساڑی کا پلو اس نے پیٹھ سے نکال کر سامنے ڈال لیا تھا اور اپنے ہاتھ سے تھام رکھا تھا۔

'کہاں سے آرہی ہو؟' میں نے محض سوال کرنے کی خاطر سوال کیا۔

'بازار سے۔'

اس سے آگے کہنے کے لئے مجھے کچھ نہ سوجھا۔ پھر وہی بولی، 'آج کل ہو کہاں؟ دکھائی نہیں دیتے؟'

'گھر ہی میں ہوتا ہوں۔ اگر تم آتیں تو معلوم ہو جاتا۔'

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا، 'بھابی کیسی ہے؟'

'ٹھیک ہے۔ تمہیں یاد کرتی ہے۔'

'یہ سچ نہیں ہے۔' اس نے ہنس کر جواب دیا۔ 'وہ مجھے گالیاں دیتی ہوگی۔'

'گالیاں تو نہیں دیتی لیکن اگر دیتی تو بھی غلط نہ ہوتا۔ اس نے دکھ میں زندگی گزاری ہے۔ اولاد نہیں ہے، شوہر کا سکھ نہیں ہے، اس کا برتاؤ ہمیں سمجھنا چاہئے۔'

'لگتا ہے تم پر اس کی باتوں کا اثر ہو گیا ہے۔ اس لئے تم اتنے دنوں سے مجھ سے ملے نہیں۔'

اس بار بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

'تمہاری بھابی بڑی گھنی ہے۔ سامنے میٹھا بولتی ہے لیکن دل میں بیر رکھتی ہے۔'

'یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تمہیں اس کے احساسات کو سمجھنا چاہئے۔'

'اب وہ سوال ہی نہیں اٹھتا۔ تم جانتے ہو۔ میں اب تمہارے بھائی سے بات بھی نہیں کرتی۔ پھر اس نے تمہیں میرے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں؟'

'اس نے کچھ نہیں کہا ہے۔'

'پھر چلو۔ ابھی چلو میرے ساتھ، میرے گھر کھانا کھاؤ۔ چلو گے؟'

میں چند لمحے خاموش رہا پھر بولا، 'گھر پر میرا انتظار ہوگا۔ پورے گاؤں میں مجھے ڈھونڈھیں گے۔'

'ٹھیک ہے تو گھر جا کر کھانا کھا لو پھر آجاؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'

'ٹھیک ہے آجاؤں گا۔'

'اور اب یہاں سے اٹھو گے کہ نہیں؟'

میں اٹھا اور ہم دونوں چل پڑے۔ وہ اپنے گھر کی سمت بڑھی اور میں یہ سوچتے ہوئے کہ اسے مجھ سے کیا بات کرنی ہے، اپنے گھر آ گیا۔ کھانا کھا کر میں اس کے گھر گیا۔

'چائے پیو گے؟' اس نے پوچھا۔

میں نے گردن ہلا کر ہاں کہا اور رسوئی گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف ہو گئی اور میں آگ کی روشنی میں اس کی حرکات کو دیکھنے لگا۔

اس نے شام کو پہنی ہوئی ساری اب تک نہیں اتاری تھی۔ صرف بالوں میں لپیٹا ہوا گجرا اتار کر رکھ دیا تھا۔ بال جلدی جلدی دوبارہ باندھ لئے تھے۔ جب وہ جھکتی تو بال اس کے چہرے کے سامنے آجاتے۔ اس کا چہرہ اس روشنی میں دمکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے لگا کہ کسی انجان قوت نے زندگی سے اس کے لگاؤ کو پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

وہ چائے لا کر میرے سامنے آبیٹھی۔ گھٹنے موڑ لئے اور تھوڑی آہستہ سے ان پر رکھ لی۔ چھوٹے بچوں کی طرح چائے کا ایک ایک گھونٹ لینے لگی۔

'مجھے کیوں بلایا ہے؟' میں نے چائے ختم کر کے پوچھا۔

'بہت دنوں سے آئے نہیں، اس لئے۔'

'کیا کہنا تھا مجھ سے؟'

'کچھ نہیں، اگر ایسا نہ کہتی تو تم آتے ہی نہیں۔'

'یہ تو ہے۔ اس طرح رات کے وقت میرا تمہارے گھر آنا ٹھیک نہیں۔'

'کیوں ٹھیک نہیں؟ کیا غلط کام کرتے ہیں ہم لوگ؟'

'غلط کام تو کچھ نہیں کرتے لیکن لوگ تو غلط سوچ سکتے ہیں۔'

'لوگوں کی اتنی پرواہ کب سے کرنے لگے؟'

'کچھ معاملوں میں کرتا ہوں، کچھ میں نہیں کرتا۔'

'بزدل ہو، اس لئے ایسا کہتے ہو۔'

'میں بزدل ہوں؟' مجھے ہنسی آگئی۔

'ہاں، بزدل۔ لوگوں کے ڈر سے مجھ سے ملنے سے کتراتے ہو۔'

'ٹھیک ہے۔ میں پندرہ سال بعد گھر آیا ہوں۔ بلاوجہ پیچیدگیاں پیدا کرنا نہیں چاہتا۔'

'اس میں کون سی پیچیدگی ہے؟ اپنی بھابی سے کہو کہ میں اتنے نیچے نہیں گری ہوں کہ اس کے دیور کے ساتھ بھی سمبندھ باندھ لوں۔ اس کے شوہر سے رشتہ توڑنے کے لئے ہی تو میں اتنی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے اس سے چھٹکارا پانا ہے۔ اسی لئے تمہیں یہاں بلاتی ہوں تاکہ وہ یہاں نہ آئے۔ اگر آئے تو تمہیں بیٹھا دیکھ کر واپس لوٹ جائے اور جب میں تم سے بات کرتی ہوں تو میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ میں گزرے دنوں کو بھول پاتی ہوں۔'

میں بے چین سا ہو گیا۔ میں اس نے آنکھ ملانے سے کترا رہا تھا۔ اس نے اپنی چائے ختم کی اور دونوں پیالیاں ایک طرف رکھ دیں۔ کچھ دیر بعد وہ بولی:

'تمہیں گورے یاد ہے؟'

'ہاں ہاں، کیوں کیا ہوا؟'

'وہ ایک بار یہاں آیا تھا۔'

'مجھ سے ملا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ یہاں گھر بنا کر رہنے کا سوچ رہا ہے۔'

'وہ نہیں لوٹے گا۔' وہ بولی۔

'کیوں؟'

'وہ میرے یہاں ٹھہرا تھا اور تمہارے بھائی نے اس پر مجھے مارا تھا۔'

'جانے دو نا۔ گزری باتیں بار بار مت دہراؤ۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔'

'تب میں نے یہی کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن گورے ڈرپوک نکلا، تمہاری طرح۔ وہ تمہارے بھائی سے ڈر گیا۔ مجھ سے ڈر گیا۔ اس نے میرے کردار، میری عزت کی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ ایک دن چپ چاپ یہاں سے چلا گیا۔ اسے بزدلی نہیں تو اور کیا کہیں گے؟'

'تم پاگل ہو۔' میں نے اس سے کہا۔ 'تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ ہر کوئی تمہیں سمجھ لے گا۔'

'ہاں، یہ میری غلطی ہے۔ خیر جانے دو۔ اس بات کو یہی بھول جاؤ۔' اس نے کہا اور کوئی بات کرنے لگی۔

مجھے اکتاہٹ ہونے لگی۔ آنکھوں پر نیند بھی چھانے لگی۔ میں نے پیر پھیلا لئے اور کچھ دیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ اسی طرح بولتی رہی اور میں چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ پوری رات باتیں کرتی رہی۔ آخر مجھے احساس ہوا کہ بھور ہوگئی ہے۔ کیا بجا ہے؟ اس نے پوچھا۔

'ساڑھے پانچ'

'تم اب فوراً گھر چلے جاؤ۔' اس نے کہا۔ میں اٹھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر پہنچا۔ پچھلا دروازے کھلا تھا اور بھائی وہاں کھڑا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اور آہستہ آہستہ دن گزرنے لگے۔ دن کی لکیریں زیادہ اور زیادہ لمبی کھنچنے لگیں۔ کہرا کافور کی طرح غائب ہوگیا۔ ہرے کھیتوں پر دھول کی تہیں جمنے لگیں۔ پاؤٹے (سفید چکنے چھلکوں والی پھلیاں) کے ہرے پتے بھورے ہونے لگے۔ ٹھنڈ کم ہوتی گئی۔ دوپہر کے وقت گرمی محسوس ہونے لگی۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دھول کے بادل اڑنے لگے۔ میں دن پر بابا کے ساتھ سامنے کے چبوترے والے برآمدے میں بیٹھا رہنے لگا۔

ایک دن جب میں یونہی گھر میں بیٹھا تھا، اسحٰق ہمارے گھر آیا۔

وہ انہی دنوں افریقہ سے آیا تھا جیسے ہی اس نے برآمدے میں قدم رکھا اس کے لگائے ہوئے عطر کی مہک سارے میں پھیل گئی۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا رکھا تھا۔ وہ پتلون پہنے ہوئے تھا اور بنیان کی اوپر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ وہ نماز پڑھ کر آیا ہوگا۔ اندر پیر رکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

'وعلیکم السلام، آؤ آؤ بیٹھو۔' بابا نے کہا۔

وہ برآمدے کے چبوترے پر بیٹھ گیا اور میری طرف مڑ کر بولا:

'کیوں رے! جمعہ کی نماز میں نہیں آئے؟'

بابا کے سامنے اس کا نماز کا ذکر چھیڑنا مجھے اچھا نہیں لگا لیکن اسے کوئی نہ کوئی جواب دینے کی خاطر میں نے کہا، 'یاد نہیں رہا۔۔۔۔'

'یاد نہیں رہا؟' اس نے غصہ سے پوچھا۔ 'مسلمان ہو یا کون ہو؟ ہمارے کیپ ٹاؤن میں سارے عیسائی گرجا گھر جاتے ہیں۔ کوئی نہ جائے تو پادری اسے برادری سے باہر نکال دیتے ہیں۔'

'اچھا؟ تو اب تمہارا کیا خیال ہے؟ مجھے برادری سے باہر نکالو گے کیا؟' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

'نہیں! اگلے جمعہ کو نماز میں آنا پھر نہیں کچھ نہیں کہوں گا۔'

میں نے ایک بار بابا کی طرف دیکھا پھر اس سے کہا، 'میں نماز نہیں پڑھتا، تمہیں پتہ ہے نا؟'

'سنو! آپ کا بیٹا کہہ رہا ہے، ذرا سنئے! نماز نہیں پڑھتا! اسے کچھ نصیحت کیجئے۔' اس نے بابا کی طرف مڑ کر کہا۔

'تم ہی کہو۔' بابا نے کہا اور چپ ہو گئے۔ اس پر وہ اور طیش میں آ گیا۔ وہ بابا کی طرف سے رخ پھیر کر مجھ سے بحث کرنے لگا۔

'تم نماز نہیں پڑھتے؟ پھر تمہارا فرقہ کون سا ہے؟' اس نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔

'کوئی بھی نہیں۔'

'لیکن تم کلواڑیوں کی طرف ہو، ہے نا؟'

'پہلے تھا، اب نہیں ہوں۔'

'پھر میری زمین مجھے ان سے واپس دلواؤ۔'

'نہیں! وہ اب انہی کی ہے۔ وہ اب قانونی طور پر ان کی ملکیت ہے۔'

'واہ! پھر تم کیسے مسلمان ہو؟ ہمارا نقصان کرنے والے؟'

میں نے اسحاق کے سوالوں کا جواب دینا بند کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جھگڑا چھیڑنے کے ارادے سے آیا تھا اور اس جھگڑے میں بابا کو اپنی طرف کرنے کی غرض سے اس نے شروع میں نماز کا موضوع چھیڑا تھا۔ لیکن میرے خاموش رہنے سے اسحٰق اور بھڑک گیا۔

'تمہارے بھائی کے ساتھ مار پیٹ ہوئی۔ کیا تمہیں اس پر بھی شرم نہیں ہے؟ تم نے انہیں سر پر چڑھایا اور کام ہوتے ہی انہوں نے تمہیں دھتکار دیا۔ خوب دھوکا دیا انہوں نے تمہیں!'

میں اٹھ کر گھر میں چلا گیا۔ اس نے آگے کیا کہا۔ مجھے معلوم نہیں لیکن جب تھوڑی دیر بعد لوٹا تو وہ جا چکا تھا اور بابا وہیں اکیلے بیٹھے خالی آنکھوں سے اپنے سامنے گھور رہے تھے۔

(بشکریہ 'آج')

(جاری)

دیارِ غربت

گوائے ڈی موپانسا
۱۸۵۰ء ۱۸۹۳ء

پہاڑی کے دامن میں ایک جگہ چھوٹے سے تالاب کے پاس دو جھونپڑیاں موجود تھیں۔ اپنے بچوں کی پرورش کے لئے ان جھونپڑیوں کے مالک دونوں دیہاتی سامنے موجود بنجر زمین پر سخت محنت کرتے تھے۔ دونوں کنبوں میں چار چار بچے تھے جو اپنے گھروں کے دروازے کے سامنے دن بھر کھیلا کرتے اور شوروغل مچاتے رہتے۔ ان میں سب سے بڑے بچے کی عمر ۱۵ سال اور چھوٹے کی محض پندرہ ماہ تھی۔ دونوں آدمیوں کی شادی اور بچوں کی پیدائش تقریباً ساتھ ساتھ ہی انجام پائی تھی۔

بچوں کی مائیں تو بمشکل ان بچوں کو ایک ساتھ گود میں اٹھا لیتی تھیں لیکن باپ کے لئے یہ امر تقریباً ناممکن ہی تھا۔ یہ آٹھ نام ان کے دماغوں میں گڈمڈ ہوکر ہمیشہ گونجتے رہتے تھے۔ جب انہیں کسی ایک کو آواز دینی ہوتی تو تین چار نام پکارنے کے بعد ہی صحیح نام ان کی زبان پر آتا تھا۔

رولے پورٹ کی جانب سے آنے پر جو پہلی جھونپڑی تھی وہ 'توا شے' کی تھی جس کے تین لڑکیاں اور ایک لڑکی تھی۔ دوسری جھونپڑی 'ویلنس' کی تھی جس کے تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔

سوپ، آلو اور تازی ہوا کے درمیان ان کی زندگی بڑی جدوجہد کے ساتھ گزر رہی تھی۔ صبح سات بجے اور شام چھ بجے دونوں کنبوں کی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو گھیر کر اسی طرح یکجا کرتیں جیسے کسان اپنی بطخوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ لوگ عمر کی ترتیب کے لحاظ سے لکڑی کی اس میز کے پیچھے بیٹھتے جس کی پالش گزشتہ پچاس برسوں کے مسلسل استعمال کے سبب گھس چکی تھی۔

کنبہ کے ہر فرد کے سامنے پانی جذب کئے ہوئے بریڈ سے بھری سوپ کی ایک پلیٹ، ساتھ میں پکے ہوئے آلو کے کچھ ٹکڑے، آدھا پتہ گوبھی اور تین پیاز رکھ دی جاتی تھی۔ مائیں چھوٹے بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی تھیں۔

> فکشن کے عالمی ادب میں سرفہرست جو چند نام آتے ہیں، ان میں موپانسا بھی شامل ہیں۔ فرنچ زبان کے ادب میں ان کی بالادستی کو کبھی چیلنج نہیں کیا جاسکا۔ انہیں ادبی وراثت اپنی ماں سے ملی جو شیکسپیئر کی بہت بڑی مداح تھیں۔ انہوں نے اپنے کیریئر کی شروعات بطور صحافی کی اور فرانس کے مختلف مشہور اخبار و رسائل ان کے کالم شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں کچھ کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے۔ انہوں نے ناول بھی لکھے۔ پیش ہے ان کی مشہور کہانی 'دیارِ غربت' جس کا ترجمہ **حمید الحسن زیدی** نے کیا ہے۔

ہر اتوار کو بطور دعوت انہیں گوشت کا ایک ٹکڑا مل جاتا۔ ان کے باپ میز کے پاس بیٹھ کر ہمیشہ یہی کہتے:

'کاش! میں تم لوگوں کو روزانہ ایسی غذا دے سکتا!'

ایک دن، اگست کی ڈھلتی دوپہر میں ایک ٹم ٹم جھونپڑی کے سامنے آکر رکی جسے ایک نوجوان لڑکی چلا رہی تھی۔ اس کے اپنے قریب بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا:

'ہینری! ذرا ان بچوں کو دیکھنا! کیا وہ بچے دھول مٹی میں کھیلتے ہوئے اچھے نہیں لگتے؟'

ہینری نے کوئی جواب نہ دیا۔ عموماً جذباتی ہوکر اس طرح اچانک ایسے جملے کہنا حیرت انگیز نہیں تھا لیکن بیوی کے اس سلوک سے اسے تکلیف ضرور ہوتی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ بیوی کی یہ پھٹکار اسی پر نشانہ ہے۔

وہ نوجوان لڑکی جوش میں کہتی چلی گئی:

'پریشان مت ہو، میں صرف ان کے پاس جاکر انہیں پیار کرنا چاہتی ہوں۔ چومنا چاہتی ہوں۔ میں ان میں سے اس بچے کو پیار کرنا چاہتی ہوں جو سب سے چھوٹا ہے۔'

یہ کہتے ہوئے وہ ٹم ٹم سے اتر کر ان بچوں کی طرف دوڑ پڑی۔ اس نے توا شے کے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا لیا، اس کے گندے رخساروں، غبار آلود سنہرے گھنگھرالے بالوں اور مٹی سے سنے ہوئے ہاتھوں کو گود میں لے کر بے تحاشہ چومنے لگی اور وہ بچہ اس انچاہے پیار سے بچنے کے لئے ہوا میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

اس کے بعد وہ لڑکی اپنی گاڑی میں بیٹھی اور ٹم ٹم تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن اگلے ہفتہ وہ دوبارہ واپس آئی اور اس بار وہ زمین پر بیٹھ

گئی۔ اس بچے کو اپنی بانہوں میں بھر لیا اور کیک سے اس کا منھ بھر دیا۔ دوسرے بچوں کو بھی مٹھائی دی۔ وہ ان کے ساتھ کسی شرارتی بچے کی طرح کھیلتی رہی۔ سارے وقت اس کا شوہر صبر کئے ہوئے گاڑی میں بیٹھا رہا۔

اگلے ہفتے وہ پھر آئی۔ اس بار وہ بچوں کے والدین سے بھی ملی اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کے بعد وہ مستقل آنے لگی اور جب وہ آتی تو ساتھ میں پیسے اور کھانے کے لئے اچھی چیزیں ضرور لے کر آتی۔ اس کا نام 'مادام ہینری دہبرس' تھا۔

ایک صبح اس کا شوہر بھی گاڑی سے نیچے اترا۔ بچوں سے بغیر بات کئے ہوئے دونوں جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔

بچوں کے والدین اندر کھانا پکانے کے لئے کلہاڑی سے لکڑی کاٹ رہے تھے۔ یوں اچانک مہمانوں کی آمد سے وہ حیران رہ گئے۔ انہوں نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کرسیاں دیں اور کھڑے ہو کر گفتگو شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر میں کانپتی آواز میں لڑکی نے کہا:

'دیکھیے! میں..... میں آپ لوگوں سے اس لئے ملنے آئی ہوں کیونکہ..... کیونکہ میں آپ کے ایک بچے کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔'

ماں باپ حیران رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دیں۔ لڑکی نے ایک گہری سانس لی اور بات آگے بڑھائی

'دیکھئے! ہمارے کوئی بچہ نہیں ہے۔ ہم بالکل اکیلے ہیں۔ میں اور میرے شوہر۔ ہم آپ کے بچے کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں گے۔ کیا آپ ہمیں بچے کو لے جانے دیں گے؟'

بچے کی ماں اب بات سمجھنے لگی تھی۔

'تو آپ ہمارے 'چالوں' کو لے جانا چاہتی ہیں۔' اس نے کہا، 'نہیں'

'یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔'

حالات سنبھالنے کے لئے اب ہبرس کو دخل دینا پڑا۔

'شاید میری بیوی اپنی بات آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہیں پائی ہے۔' اس نے کہا۔ 'میں بتاتا ہوں، ہم آپ کے بچے کو گود لینا چاہتے ہیں۔ آپ کا بیٹا آپ سے ملنے یہاں آتا رہے گا۔ بڑے ہونے پر اگر وہ اچھا انسان بنا جیسا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا، تو ہم اسے اپنا وارث بنائیں گے۔ اگر کبھی خدا کے فضل سے ہمارے اپنے بچے بھی ہوئے تب بھی یہ ہماری ملکیت میں ان کے ساتھ برابر کا شریک رہے گا۔ لیکن اگر ہماری بہترین پرورش کے باوجود یہ بہتر انسان نہ بن سکا اور اس نے برائی کا دامن تھام لیا تو اس کی اکیسویں سالگرہ پر بیس ہزار فرینک ملیں گے۔ یہ رقم ہم ابھی اس کے نام جمع کرا دیں گے ساتھ ہی ہم آپ کو بھی نہیں بھولے ہیں۔ جب تک آپ لوگ زندہ رہیں گے۔ ہم ہر مہینے آپ کو سو فرینک دیتے رہیں گے۔'

'شاید میری بیوی اپنی بات آپ کو ٹھیک سے سمجھا نہیں پائی ہے۔' اس نے کہا۔ 'میں بتاتا ہوں، ہم آپ کے بچے کو گود لینا چاہتے ہیں۔ آپ کا بیٹا آپ سے ملنے یہاں آتا رہے گا۔ بڑے ہونے پر اگر وہ اچھا انسان بنا جیسا کہ ہم امید کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا، تو ہم اسے اپنا وارث بنائیں گے۔ اگر کبھی خدا کے فضل سے ہمارے اپنے بچے بھی ہوئے تب بھی یہ ہماری ملکیت میں ان کے ساتھ برابر کا شریک رہے گا۔ لیکن اگر ہماری بہترین پرورش کے باوجود یہ بہتر انسان نہ بن سکا اور اس نے برائی کا دامن تھام لیا تو اس کی اکیسویں سالگرہ پر بیس ہزار فرینک ملیں گے۔

عورت غصہ سے تلملاتی ہوئی کھڑی ہوئی گئی۔

'آپ چاہتے ہیں کہ میں 'چالوں' کو فروخت کر دوں۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایک ماں سے ایسا کرنا تو دور، سوچنے کے لئے بھی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔ ایک ماں کے لئے اس سے خطرناک کام دوسرا نہیں ہوسکتا۔'

بچے کا باپ فکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی لیکن وہ اس کے سر کی جنبش اسکی بیوی کی باتوں کی حمایت کرتی نظر آرہی تھی۔

'مادام دہبرس' یہ سن کر اپنے جذبات پر قابو نہ کر سکیں اور رونے لگیں۔ 'مادام دہبرس' نے اپنے شوہر کی طرف ان عجیب نظروں سے دیکھا جو ہر اس شئے کو پالیتا ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور سسکتی ہوئی بولی:

'یہ لوگ ایسا نہیں کریں گے، ہینری! اپنا بچہ ہمیں کبھی نہیں دیں گے۔' لیکن پھر اس نے آخری کوشش کی، 'لیکن دوستو! اپنے بچے کے سنہرے مستقبل کے بارے میں سوچئے، اس کی خوشیوں کے بارے میں سوچئے، اس کے.....'

اس پر بچہ کا باپ اٹھ کھڑا ہوا۔ غصہ سے کانپتی آواز میں اس کے مادام کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

'ہم آپ کی بات پوری طرح سمجھ چکے ہیں۔ ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ ہم اپنا بچہ کسی بھی قیمت پر نہیں دیں گے۔ اب آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں اور ہمارے گھر کے قریب بھی نہ دکھائی دیں۔ اس طرح کسی کے بچے کو لے جانے کی کوشش کرنا جرم ہے، جانتے ہیں آپ؟!'

جھونپڑی سے باہر آتے ہی 'دہبرس' نے اچانک سوچا کہ یہاں پر اس عمر کے دو بچے تھے۔ سسکیوں کے بیچ مایوس لیکن اپنے موقف پر مستحکم خاتون کی طرح جو کسی طرح کے انتظار کو آمادہ نہیں

تھی، پوچھا:

'اور، وہ دوسرا بچہ؟ وہ آپ کا نہیں ہے؟'

'نہیں۔' تواشے نے کہا۔ 'پڑوسیوں کا بچہ ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے پاس جا کر بات کر سکتے ہیں۔'

یہ کہتے ہوئے تواشے گھر کے اندر چلا گیا جہاں سے اس کی بیوی کی غضب آلود آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔

تواشے کی بات سن کر وہ دونوں دوسرے جھونپڑے میں گئے جہاں ویلنس کا کنبہ کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا روٹی کے ٹکڑوں پر پلیٹ میں رکھے مکھن کو چاقو سے کاٹ کر ہلکی پرت لگاتے ہوئے بے دلی سے کھا رہا تھا۔

اس بار ہینری نے ڈپلومیسی کا سہارا لیتے ہوئے نہایت کی ہوشیاری سے اپنے منصوبے کا خلاصہ کیا۔ ہینری کی بات سن کر بچہ کے والدین نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی لیکن جب انہوں نے سو فرینک ماہانہ ملنے کی بات سنی تو ان کے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ کافی دیر تک دونوں اپنے اندرونی جذبات کے تصادم سے لڑتے رہے۔ آخر میں بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔

'تم کیا سمجھتے ہو؟'

'میں سمجھتا ہوں کہ ان کی بات' ماننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔' بچہ کے باپ نے بامعنی انداز میں جواب دیا۔

پس وپیش میں مبتلا 'مادام دہیئرس' نے ایک بار پھر بچے کے سنہرے مستقبل اور اس کی خوشیوں کی بات کہتے ہوئے اس رقم کی بابت بتایا جو اس بچے کے حصے میں آسکتی ہے۔

آپ جس طرح ہمیں بارہ سو فرینک سالانہ دینے کی بات کر رہے ہیں، کیا یہ مسئلہ نوٹری کے سامنے طے ہو سکے گا۔ باپ نے پوچھا۔

'یقینی طور پر۔ اگر آپ چاہیں تو کل ہی یہ کام ہو جائے گا۔' ہینری نے کہا۔

بچہ کے باپ نے، جو ابھی بھی فکرمند تھا، اپنی بات جاری رکھی۔

'لیکن..... اگر آپ ہمارے بچے کو لے جانا چاہتے ہیں تو سو فرینک ماہانہ کم ہیں۔ آپ خود سوچئے۔ اگر یہ یہیں رہتا ہے تو کچھ برسوں بعد کام کرنے لگے گا۔ اس نظریئے سے ہمیں ماہانہ ایک سو بیس فرینک چاہئے۔'

'مادام دہیئرس' نے اپنے جذبات قابو

اس کے بعد اس چھوٹے بچے جین ویلنس کے موضوع پر کسی نے کچھ نہیں سنا۔ ہر مہینے بچے کے والدین نوٹری کے پاس اپنے ایک سو بیس فرینک لینے جاتے رہے۔ تواشے کی عورت اپنے دروازے پر کھڑی ہو کر انہیں گالیاں بکتی رہی جس کے نتیجہ میں ان کے درمیان روز جھگڑے ہونے لگے تھے۔ وہ ویلنس کے کنبہ کو نشانہ بنا کے کہتی تھی کہ اپنے بچے کو فروخت کرنا گناہ ہے۔ یہ ذلت آمیز اور غیر انسانی کام ہے۔ روزانہ وہ چارلو کو گود میں لے کر فخر کے ساتھ اپنی بات کہتی گویا وہ چھوٹا بچہ اس کی باتوں کو سمجھ رہا ہو۔ 'میں نے اپنے بچے کو نہیں بیچا ہے۔

کرتے ہوئے بچہ کے باپ کی شرط تسلیم کر لی۔ چونکہ وہ بچے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی، اس لئے جب اس کا شوہر معاہدہ کا مسودہ تیار کر رہا تھا، اس نے فوراً اپنے پرس سے سو فرینک نکال کر بچہ کے والدین کو بطور ہدیہ پیش کئے۔ معاہدہ کے کاغذات تیار ہونے کے بعد اس نے میئر اور دو گواہوں کو وہیں بلوا لیا۔ میئر کے سامنے دونوں گواہوں کے ساتھ سب نے دستخط کر دئے اور 'مادام دہیئرس' اس روتے ہوئے بچے کو اپنے ساتھ لے کر خوشی خوشی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

اس کے بعد اس چھوٹے بچے جین ویلنس کے موضوع پر کسی نے کچھ نہیں سنا۔ ہر مہینے بچے کے والدین نوٹری کے پاس اپنے ایک سو بیس فرینک لینے جاتے رہے۔ تواشے کی عورت اپنے دروازے پر کھڑی ہو کر انہیں گالیاں بکتی رہی جس کے نتیجہ میں ان کے درمیان روز جھگڑے ہونے لگے تھے۔ وہ ویلنس کے کنبہ کو نشانہ بنا کے کہتی تھی کہ اپنے بچے کو فروخت کرنا گناہ ہے۔ یہ ذلت آمیز اور غیر انسانی کام ہے۔ روزانہ وہ چارلو کو گود میں لے کر فخر کے ساتھ اپنی بات کہتی گویا وہ چھوٹا بچہ اس کی باتوں کو سمجھ رہا ہو۔ 'میں نے اپنے بچے کو نہیں بیچا ہے۔'

برسہا برس گزرتے گئے لیکن تواشے کی بیوی اپنی اس قلبی کیفیت سے ابھر نہ سکی۔ وہ روزانہ اپنی جھونپڑی کے دروازے پر کھڑی یہ سوچ کر گالیاں بکتی رہی کہ اس کی باتوں کو ویلنس کا کنبہ ضرور سن رہا ہوگا۔ آہستہ آہستہ اس کو قلبی طور پر یقین ہو گیا کہ چونکہ اس نے اپنا بچہ فروخت نہیں کیا اس لئے وہ پڑوس کے کسی بھی کنبہ سے زیادہ بہتر ہے۔ وہ خود کو دوسروں کے لئے ایک آئیڈیل سمجھنے لگی۔

'اسے لالچ دی گئی تھی لیکن یقیناً اس نے ایک اچھی ماں کا کردار نبھایا' علاقہ کے سبھی لوگ اس کی تعریف کرتے۔

'چارلو اب اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا۔ گزشتہ کئی برسوں سے بار ہا سنتے سنتے اس کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ وہ بیچا نہیں گیا اس لئے وہ دوسروں سے بہتر ہے۔

ویلنس کا کنبہ ماہوار ملنے والی پنشن سے خوش تھا اور ان کی زندگی بہتر طریقہ سے گزر رہی تھی۔

دوسری جانب تواشے کے کنبہ پر غربت چھائی رہی۔ بڑا بیٹا فوج میں بھرتی ہوگیا۔ دوسری بیٹے کی وفات ہوگئی تھی۔ کنبہ میں روزی روٹی کے لئے صرف چارلو ہی بچا تھا جس کے کاندھوں پر اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ دو چھوٹی بہنوں کے گزر بسر کی سنگین ذمہ داری عائد ہوگئی تھی۔

ایک صبح، اس کی اکیسویں سالگرہ سے پہلے، ایک بیحد خوبصورت گاڑی دونوں جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی۔ گاڑی سے ایک نوجوان ہاتھ میں سنہری چین پہنے تیزی سے نیچے اترا اور گاڑی سے ایک سفید بالوں والی بزرگ خاتون کو نیچے اترنے میں مدد کی۔

'وہ رہا دوسرا جھونپڑا' بزرگ خاتون نے اسے بتایا۔

یہ سنتے ہی نوجوان اس جھونپڑے میں اس بے فکری سے داخل ہوا جیسے وہ جھونپڑا اسی کا ہو۔

اندر اس کی ماں کپڑے دھو رہی تھی۔ باپ جو کافی بوڑھا ہوگیا تھا، آگ کے سامنے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نوجوان نے پکارا، دونوں نے اسے چونک کر دیکھا۔

ماں، بابا۔

دونوں اچانک کھڑے ہوگئے۔ گھبراہٹ اور مامتا سے اس کی ماں کے ہاتھ سے صابن چھوٹ کر پانی میں گر گیا۔

'ارے! یہ تم ہو؟' ماں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ 'واقعی تم میرے ہی بیٹے ہو؟'

نوجوان نے آگے بڑھ کر ماں کو بانہوں میں بھر لیا۔ 'ہاں ماں، میں ہی ہوں، تمہارا بیٹا'

بوڑھا باپ جوش سے کانپ رہا تھا لیکن اس کی آواز ہمیشہ کی طرح خاموش تھی۔ 'تم واپس آگئے جین' اس نے اس طرح پوچھا جیسے اس نے جین کو ابھی ایک مہینے قبل دیکھا تھا۔

جب وہ لوگ ملاقات کر چکے تب ان لوگوں نے 'جین' پر باہر چلنے کے لئے اصرار کرنا شروع کیا تاکہ وہ اسے دوسروں کو دکھا سکیں۔ ان دونوں نے اس سے ملاقات کے لئے میئر، ڈپٹی میئر، ضلع کے پادری اور اسکول کے ماسٹر کو بلوایا۔ چارلو اپنے دروازے پر کھڑا ہوکر ان لوگوں کو جاتے دیکھ رہا تھا۔

شام کو جب کھانے کے وقت سب لوگ بیٹھے تو چارلو نے اپنے والدین سے کہا۔

'آپ دونوں نے انہیں ویلنس کے لڑکے کو بآسانی لے جانے دے کر سنگین حماقت کی ہے۔'

'ہم اپنے بچے کو بیچنا نہیں چاہتے تھے۔' اس کی ماں نے سختی سے جواب دیا۔ چارلو کا باپ خاموش رہا۔

چارلو اپنی بات کہتا رہا۔

'میں سوچتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں نے 'جین' کی طرح مجھے دے دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا'

بیٹے کی بات سن کر تواشے غصہ ہوگیا۔

'تم ہمیں اس لئے کوس رہے ہو کیونکہ ہم نے تمہیں اپنے ساتھ رکھا'

'ہاں' چارلو نے بے رحمی سے کہا۔ 'میں آپ دونوں کو کوس رہا ہوں کیونکہ آپ دونوں احمق ہیں۔ یہ اس لڑکے کی بدقسمتی ہوگی جس کے والدین آپ جیسے بیوقوف لوگ ہوں۔ آپ لوگوں کو اس بات کا اندازہ تب ہوگا جب میں آپ لوگوں کو خیر باد کہہ کر چلا جاؤں گا'

بیچارگی سے اس کی ماں پلیٹ کی طرف جھک کر رونے لگی۔ سوپ کے ہر گھونٹ کے ساتھ اس کی سسکی گونج اٹھتی اور اسی کے ساتھ میز پر بچھے کپڑے پر سوپ کا کچھ حصہ گر جاتا۔ اس طرح آدھے سوپ کے گرنے کپڑا گندا ہوگیا تھا۔

'آج میں جو ہوں، اس سے کہیں اچھا ہوتا اگر میں مر گیا ہوتا' لڑکے نے چڑھ کر کہا۔ 'جانتے ہیں، جب میں نے اسے دیکھا تو میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، اگر میرے ماں باپ نے بے وقوفی نہ کی ہوتی تو آج اس کی جگہ میں ہوتا' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

'میں جانتا ہوں کہ یہاں سے نکل کر میں ٹھیک ہی کروں گا۔ یہاں رہ کر میں دن رات آپ لوگوں کو کوستے ہوئے آپ کی زندگی جہنم بنا دوں گا۔ میں تم لوگوں کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا'

بزرگ والدین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جواب دینے کے لئے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔

لڑکا کہتا رہا:

'بس! بہت ہوا، میں اب یہاں نہیں رہوں گا۔ کہیں اور جا کر اپنی روٹی کماؤں گا' یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ ان کے کانوں میں دوسرے جھونپڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لوگ مزے سے اپنے نئے مہمان کے ساتھ ہنس بول رہے تھے۔

پیر پٹکتے ہوئے چارلو اپنے والدین کی جانب رخ کیا اور چلا کر کہا:

'اجٹ، گنوار دیہاتی'

یہ کہتے ہوئے وہ باہر پھیلی تاریکی میں گم ہوگیا۔

□□□

دوسری جانب تواشے کے کنبہ پر غربت چھائی رہی۔ بڑا بیٹا فوج میں بھرتی ہوگیا۔ دوسری بیٹے کی وفات ہوگئی تھی۔ کنبہ میں روزی روٹی کے لئے صرف چارلو ہی بچا تھا جس کے کاندھوں پر اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ دو چھوٹی بہنوں کے گزر بسر کی سنگین ذمہ داری عائد ہوگئی تھی۔ ایک صبح، اس کی اکیسویں سالگرہ سے پہلے، ایک بیحد خوبصورت گاڑی دونوں جھونپڑوں کے سامنے آکر رکی۔ گاڑی سے ایک نوجوان ہاتھ میں سنہری چین پہنے تیزی سے نیچے اترا اور گاڑی سے ایک سفید بالوں والی بزرگ خاتون کو نیچے اترنے میں مدد کی۔

حکومت اترپردیش؛ عوام کے اعتماد کی ضامن

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی اپنی پہلی ہی میٹنگ میں وزراء اور اعلیٰ افسران پر واضح کر دیا تھا کہ عوامی فلاحی عہد نامہ ۲۰۱۷ء میں کئے گئے وعدوں پر یقین کر کے عوام نے اکثریت کے ساتھ ہماری حکومت بنائی ہے لہٰذا عہد نامے کے سبھی نکات کو پوری سنجیدگی اور حساسیت کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ انہوں نے نیا نظامِ کار تیار کرنے کے لئے افسران سے ۱۵؍دنوں میں اپنی املک کی پوری تفصیل مقررہ خاکے پر فراہم کرانے کی ہدایت دی نیز مجرموں کے خلاف سخت کارروائی کرنے اور عوام کو باعزت زندگی گزارنے کے لئے بہتر ماحول بنانے کے احکامات بھی صادر کئے۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی شاستری بھون لکھنؤ میں محکمۂ داخلہ کی کارگزاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے (۲۱؍جولائی ۲۰۱۷ء)

وزیر اعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ کے مطابق اتر پردیش کی نئی حکومت وزیر اعظم جناب نریندر مودی کی رہنمائی میں ریاست میں 'سب کا ساتھ سب کا وکاس' کی طرز پر ایک نیا ڈھانچہ تیار کرنے پر آمادہ ہے جس کے تحت سماج کے سبھی طبقوں اور ریاست کے ہر ایک فرد اور حلقہ کی ترقی کے لئے کام کیا جائے گا۔ اتر پردیش ملک کی ایک ایسی ریاست ہوگی جو بدعنوانی، فسادات، شر پسندی اور غنڈہ گردی سے پاک ہوگی۔ یہاں ترقی کا ایک ایسا ماڈل پیش کیا جائے گا جس میں اتر پردیش کے نوجوانوں کو دوسری جگہ نہیں جانا پڑے گا۔ خواتین کے تحفظ کا خاص خیال ملحوظ رہے گا۔

اسی ایجنڈے کے تحت اتر پردیش حکومت میں گزشتہ ۱۰۰؍دنوں میں ترقی کے متعلق متعدد کام انجام دئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

قانونی بندوبست

- اتر پردیش میں جرم، ناانصافی اور خوف سے پاک ماحول وضع کرنے کے لئے حکومت پرعزم۔
- خواتین/لڑکیوں میں تحفظ کا اعتماد پیدا کرنے کے لئے 'اینٹی رومیو اسکوائڈ' کی تشکیل۔
- ۸؍لاکھ ۵۵؍ہزار ۱۴۷؍افراد کی جانچ، ۶۵۱؍مقدمے درج اور ۱۳۶۷؍افراد کے خلاف قانونی کارروائی اور ۳؍لاکھ ۸۴؍ہزار افراد کو تنبیہ۔
- الکٹرانک چپ لگا کر اعلیٰ پیمانے پر کم تیل دینے والے پٹرول پمپوں کا ایس ٹی ایف نے پہلی مرتبہ پردہ فاش کیا۔
- جانوروں کو غیر قانونی طریقہ سے مارنے کے لئے ہر ضلع میں ضلع مجسٹریٹ کی صدارت میں ۱۰؍رکنی کمیٹی تشکیل۔
- تعزیرات ہند کی مختلف دفعات کے تحت ۸۸؍ہزار ۹۳؍افراد میں ۴۳۶۷۵؍افراد گرفتار، ۲۲؍ہزار ۳۰۰؍افراد خودسپردگی پر مجبور ہوئے۔
- لوٹی گئی املاک (۱۷؍کروڑ ۲۷؍لاکھ ۷؍ہزار ۵۹۳؍روپئے) میں سے (۹؍کروڑ ۱۶؍روپئے) کی املاک کی برآمدگی۔
- خواتین استحصال کے رجسٹرڈ ۱۶؍ہزار ۱۵۲؍مقدموں میں ۱۱؍ہزار ۹۲۲؍افراد گرفتار اور ۱۹۲۲؍افراد نے خودسپردگی کی۔
- درج فہرست ذات و قبائل کے استحصال سے متعلق جرم میں ۳؍ہزار ۳۲۶؍درج مقدموں

میں ۴/ہزار ۶۲۰/افراد گرفتار اور ایک ہزار ۱۴۸/افراد نے خود سپردگی کی۔

- قومی تحفظاتی ایکٹ کے تحت ۲۴/مقدمے درج۔ ۲۴/افراد قید۔
- گینگسٹر ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ۵۷۷/مقدموں میں ۱۶۳۷/افراد گرفتار۔
- گینگسٹر ایکٹ کی دفعہ ۱۴(۱) کے تحت ۳۵/کروڑ روپئے کی قیمت کی املاک ضبط۔
- غنڈہ ایکٹ کے تحت ۵/ہزار ۶۷/افراد کی چالانی رپورٹ، ۱۵۹۷/افراد قید۔
- ۱۰/جون ۲۰۱۷ء سے ۱۶/جون ۲۰۱۷ء کے درمیان ۳/ہزار ۴۱۳/افراد گرفتار اور ۵۲۷/ملزم خود سپردگی پر مجبور۔
- ریاست میں ۳۹۲/انعامی بدمعاش گرفتار۔
- ۲۹۹۹ پیشہ ور اور گروہ بند مجرموں کی نشاندہی، ۸۰۷/مجرم گرفتار اور ۴۹/مجرم خود سپردگی کے لئے مجبور۔
- پانچ سال سے زیادہ مطلوب ملزموں میں سے ۱۲/ملزم گرفتار، جس میں ۱۶/انعام یافتہ مجرم شامل ہیں۔

صنعت

- صنعتی پالیسی کے تحت ریاست کو مینوفیکچرنگ ہب بنانے پر زور۔
- میک ان یوپی سیل کی تشکیل زیر عمل۔
- نجی صنعتی پارک کو فروغ دینے کا فیصلہ تاکہ ریاست میں روزگار کو بڑھاوا مل سکے۔
- سرمایہ کاری کے فروغ کے تحت سپر میگا زمرے کے تحت سیم سنگ کے ۴/ہزار ۹۱۵/کروڑ روپئے اور میگا زمرے کے تحت انٹیکس کے ۳۷۲/کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری منظور۔

شہروں اور گاؤں

- ریاستی حکومت کی کاوش سے الٰہ آباد، علی گڑھ اور جھانسی کو اسمارٹ سٹی کی سوغات۔
- میرٹھ، سہارنپور، رامپور، غازی آباد اور رائے بریلی کو اسمارٹ سٹی بنانے کے لئے حکومت کی کوشش جاری۔
- لکھنؤ، وارنسی، کانپور اور آگرہ میں اسمارٹ سٹی مشن کے تحت پروجیکٹ کو آخری شکل دی جارہی ہے۔
- وارانسی میں ۱۰/ پروجیکٹوں کے لئے ۹۰/کروڑ روپئے اور متھرا میں ۴/ پروجیکٹوں کے لئے ۳۴/کروڑ روپئے منظور۔
- اسکیم کے تحت چلائے جارہے پروجیکٹوں کے کام ۲۰۱۷ء تک مکمل ہوجائیں گے۔
- ریاست کے سبھی کنبوں کو اکتوبر ۲۰۱۸ء تک بجلی مہیا کرانے کے لئے حکومت ہند کے ساتھ 'پاور فار آل' کا معاہدہ ۱۴/اپریل ۲۰۱۷ء کو مکمل۔
- بجلی سپلائی میں عام اور خاص ضلعوں میں تفریق ختم۔ سبھی جگہ ایک طرح کا بجلی سپلائی شیڈول نافذ۔ دیہی علاقوں میں رات میں مسلسل بجلی سپلائی کو یقینی بنایا گیا۔
- دین دیال گرام جیوتی یوجنا کے تحت ۱۸/ہزار مزرعوں میں بجلی کاری کا کام پورا کیا گیا۔
- ۱۰۰/دنوں میں ۶/لاکھ ۶/ہزار ۳۱۹/بجلی کنکشن مہیا کرائے گئے۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی عالمی نوجوان مہارت یوم کے موقع پر شریک افراد کو سرٹیفکٹ دیتے ہوئے (۱۵/جولائی ۲۰۱۷ء)

فصلی قرض معافی

- ۸۶/لاکھ چھوٹے اور مارجنل کاشتکاروں کے ایک لاکھ روپئے تک کے فصلی قرضے معاف۔
- فصلی قرض معافی پر تقریباً ۳۶/ہزار کروڑ روپئے سے زائد خرچ کا امکان۔

سب کو تعلیم

- دسویں اور بارہویں کے بورڈ امتحانات نقل سے پاک۔
- ۱۴۷/ہونہار طلباء وطالبات کو رانی لکشمی بائی انعام سے سرفراز کیا گیا۔

وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اپنی سرکاری رہائش گاہ پر عوام کے مسائل سنتے ہوئے (یکم اگست ۲۰۱۷ء)

□□□

بہت پہلے علی گڑھ کی ایک ادبی تقریب میں، بنائے تقریب اس وقت مجھے یاد نہیں، غضنفر نے ایک نظم سنائی تھی اور سننے والوں سے خوب داد وصول کی تھی۔ نظم غالباً ان کے کسی قریبی دوست کے علی گڈھ چھوڑ کر (تلاش معاش میں) کہیں اور چلے جانے سے متعلق تھی۔ اس وقت غضنفر ادبی دنیا کے بہت معروف غضنفر نہیں تھے۔ اُن کی اس نظم میں آہنگ بھی تھا اور اثر بھی اور غضنفر نے اپنے پڑھنے کے انداز سے اسے اور پُراثر بنا دیا تھا۔ دوسرے سننے والوں کی طرح میں نے بھی اس نظم کی خوب داد دی۔ اس کے بعد اُن سے ملاقات والے موقعوں پر میں انہیں اس نظم کی یاد دلا کر شاعری کی طرف سے اُن کی بے اعتنائی کا شکوہ بھی کرتا رہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ غضنفر اپنی مادرِ علمی کے دوسرے ہم سبقوں کی طرح شاعری کی طرف مستقلاً مائل ہوتے انہوں نے اپنے اندر اُس قصہ گو کو دریافت کرلیا جو کہانی کی راہ پر انہیں بہت دور تک لے آیا۔ اب وہ کہانی بیان کرنے کو اپنا اصل ہنر سمجھنے لگے۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک کے بعد ایک اپنی تراشی ہوئی حکایتوں کو بڑی شدومد کے ساتھ وہ زمانۂ حال کے ملبوس میں سامنے لانے لگے۔ واقعہ گوئی اور حکایت نویسی کے اس غالب رجحان کے سبب سب کو محسوس ہونے لگا کہ ناول ہی غضنفر کا اصل میدان ہے اور وہ اس رجحان کی رَو کو روکنا نہیں چاہتے۔ سو اس رو میں بہہ کر اپنے اصل اور پرانے شوق کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ ناول کی طرف آ کر اور بہت دیر اس دنیا میں رہ کر دوبارہ شاعری کی طرف آنے میں انہیں بہت دیر لگی۔ التوائے شعر کے اس عرصے میں کبھی کبھی خلق ہونے والی ان کی شاعری کا مجموعہ ''آنکھ میں لکنت'' اس وقت سامنے آیا جب ان کی ناول نویسی ان کی تخلیقی شخصیت پر اپنا اقتدار قائم کر چکی تھی اس لیے پڑھنے والا اُن کی قلمرو تصنیف میں ان کی شاعری کو آنکھ جما کر نہیں دیکھ سکا۔ اُن کا شعر اگرچہ ان کے ناول ہی کے پائے کا تھا لیکن ان کے ناولوں کی تمثالیں اتنی زیادہ روشن تھیں کہ غضنفر کا شعر اس روشنی میں نظر آنے کی طرح نظر نہیں آیا۔ لیکن ان کی شاعری کو اُن کے ناول کی طرح نہ پڑھنے والا قاری اچانک اس وقت چونکا جب ایک الگ جا پڑنے والی شعری صنف میں انہوں نے کئی سو شعر کہہ ڈالے اور اپنے اندر دب جانے والی چنگاری کو شرر کی شکل دے کر خانۂ دل کی خرابی (تڑپ) کو جہانِ موجود کی خراب حالی کا آئینہ بنا دیا۔

ہزار سے زیادہ بیتوں پر مشتمل پیشِ نظر شعر پارے کے خلق ہونے کا سبب غضنفر نے اپنی اس تخلیقی تڑپ کو قرار دیا ہے جو آشوب ہائے زمانہ کی سنگینیوں کے سبب انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے رہی تھی۔ یوں بھی غضنفر سست قلم یا آرام طلب ادیب نہیں ہیں۔ منصبی مسائل میں الجھے رہنے کے باوجود اُن کی سریع النویسی لائقِ رشک ہے۔ ابھی انہیں بہت زمانے تک لکھنا ہے لیکن اب تک انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ قلم ہمہ وقت ان کے ہاتھ میں رہتا ہے اور دیکھے اور محسوس کئے ہوئے کو باہر لانے کے لیے وہ ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔ ہم عصر لکھنے والوں میں لکھتے رہنے کی یہ سرعت اور استقلال ان کا اختصاص ہے۔

غضنفر، سب جانتے ہیں اور کہا بھی جا چکا ہے کہ

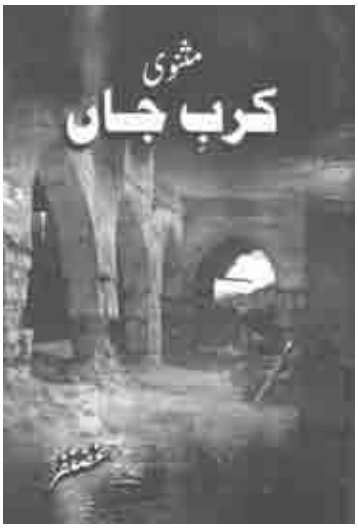

مبصر : پروفیسر انیس اشفاق
قیمت : 225 روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔6

ملنے کا پتہ

بشریٰ پبلی کیشن، لین A، حمزہ کالونی، سرسید نگر، علی گڑھ

ناول کے میدان میں زیادہ نمایاں ہیں اور تخلیقی نثر سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے پیشِ نظر تخلیق میں پیش کیا ہے اسے وہ ناول میں زیادہ قدرت قلم کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ تو پھر ایک معدوم ہوتی ہوئی صنف مثنوی کی طرف آنا انہوں نے کیوں ضروری جانا۔ اس کا ایک سبب تو وہی ہے جو انہوں نے بیان کیا ہے۔ یعنی مثنوی کے درس میں ان کے مدرّس خلیل الرحمن اعظمی کا درک اور اس درک کے نتیجہ میں مثنوی کی جانب ان کا میلان۔ دوسرا سبب جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ غضنفر بیانیے کی طرف طبعاً مائل ہیں اسی لیے تازہ واردات کے بیان کے لیے جب وہ نظم کے میدان میں وارد ہوئے تو انہوں نے اُس صنف کو منتخب کیا جو شعری بیانیے کے لیے مخصوص ہے اور اس صنف میں اس بحر کا انتخاب کیا جو اپنے غنائی وزن کے باعث سب سے زیادہ مقبول ہے۔ فردوسی کے شاہنامے سے لے کر اقبال کے ساقی نامے تک حدیثِ دل اور حدیثِ دیگراں کے بیان میں ہمارے شاعروں نے بیشتر اسی بحر کا استعمال کیا ہے۔ غضنفر کی اس مثنوی میں جو چیز سب سے پہلے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے زبان کا آزادانہ استعمال۔ ایک طرف انہوں نے شعری بیانیے کی اس صورت گری میں مثنوی کے روایتی شکل نامے (Format) کا لحاظ رکھا ہے تو دوسری طرف اپنے قاری کو دل اور دنیا کے دریچوں میں لے جانے کے لیے خود کو لسانی بندشوں سے آزاد کرلیا ہے۔ اگر وہ حرف کی اس حریت کو روا نہ رکھتے تو جو کچھ جس طرح کہنا چاہتے تھے، نہ کہہ پاتے۔ یوں بھی تخلیق کی تڑپ اور جذبے کا وفور ہر محل پر لسانی آداب کا لحاظ نہیں رکھ پاتا۔ اسی تخلیقی اضطراب اور شتابیت کو نگاہ میں رکھ کر اقبال نے کہا تھا:

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

غضنفر کے اندر اپنے عہد کی آویزش کا مرثیہ لکھنے کی جو تڑپ پیدا ہوئی تھی اور تخلیق کا جو سوتا ان کے اندر پھوٹا تھا اس کے سیل میں زبان کی نوک پلک کو بہت زیادہ سنوارنے کا وقت ان کے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ ہر ہر قدم پر زبان کو سنبھالے رکھنے کا خیال رکھتے تو خیال کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور جذبے کا شور مدھم پڑ جاتا۔ سو انہوں نے اپنے تخلیقی داعیے (Urge) کو اس کی فطری لے میں آگے بڑھنے دیا اور اپنے لسانی قالب کو زبان کے روایتی آداب کا پابند نہیں بنایا۔

جن نکتہ یاب نگاہوں نے ان کی مثنوی کا مطالعہ کیا ہے اُن کی روشنیوں نے مثنوی کی بہت سی لسانی اور معنوی خوبیوں کو منور کیا ہے۔ آزاد اور نثری نظم کے زمانے میں عجز بیان کے باعث ہمارے نئے شاعر قافیوں سے آزاد پابند شاعری (نظم معرّیٰ) کی طرف آنے کی ہمت نہیں کرتے اور اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں غضنفر کا مثنوی کی طرف آنا اور آ کر سلامت روی کے ساتھ نکل جانا یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ ہم سب ان کی ایسی ہی شاعری سے لبریز ان کی ایک اور تخلیق کے منتظر ہیں۔ □□□

'وصفِ پیغمبری نہ مانگ' شائستہ فاخری کا افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں کل 14 افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کے عنوان ہیں ، بوئے گل نالہ دل ، عالم خاک وآب وباد، خشک پتوں کی موسیقی، آتش زیر پا، دردشورانگیز ،ساجھی خوشیاں ساجھے غم، آدمی ہوں وصف پیغمبری نہ مانگ ، خوابوں کا نیلا سمندر اور تاریک راتیں ، لاحاصلی کے تعاقب میں، شیشے کے آبلے، پرآشوب موسم، کرب ناگفتنی ، ایک ادھورا سچ اور عدم کے وجود میں ۔مذکورہ افسانوں کو پڑھنے کے بعدان کے عنوانات پرغور کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کتنی زبردست تخلیقیت ،معنویت اور تلازمیت پائی جاتی ہے۔

شائستہ فاخری ایک حساس خاتون ہیں،اس لئے ان کی تحریروں میں عصری حسیت بڑی شدت سے پائی جاتی ہے۔ان کی کہانیوں میں انسان کے دکھ درد، کام کے دباؤ،عصری مسائل اورسماجی پیچیدگیوں کااظہار بڑے کرب انگیزانداز میں ملتاہے۔ان کے فن پاروں میں عورت کے کئی روپ ملتے ہیں۔نصف آبادی کے معاملات،اس کے احساسات وجذبات،اس کی ذہنی کشمکش وافتادطبع، اس کی خوشی وغم ،اس کی گھریلو پریشانیوں اور باہری دنیا کی دشواریوں کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیاہے۔اپنی بات کہنے کے لئے انھوں نے بیانیہ کے ساتھ ساتھ علامات،استعارات اور تلمیحات کا بھی سہارالیاہے۔کرداروں کے ذریعے بہت سے سوال بھی اٹھائے ہیں۔ان کے افسانوں میں فنی وموضوعاتی دونوں سطح پرقدیم وجدید کاحسین امتزاج پایاجاتاہے۔بعض سماجی رویوں کومثبت اورنئی جہت دی ہے۔ان کے یہاں ماضی کاعرفان،حال کااحساس اور مستقبل کا ادراک پایا جاتا ہے۔مواد، ہیئت، پلاٹ،تکنیک ،کردارنگاری اور جزئیات نگاری کے اعتبار سے بھی ان کی کہانیاں کامیاب ہیں۔ان کا سماجی شعورگہرا،ادبی ذوق ستھرااورفنی رچاؤاچھاہے۔ان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جتنی باتیں وہ الفاظ میں کہتی ہیں اس سے کہیں زیادہ بین السطور میں پوشیدہ ہوتی ہیں۔اس کے ذریعے وہ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جاتی ہیں۔یہ ان کی فنی چابکدستی کا کمال ہے۔

شائستہ کے اندرغضب کی خود اعتمادی بھی پائی جاتی ہے۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایاجاسکتاہے کہ انھوں نے اپنی کتاب پرکسی سے تقریظ نہیں لکھائی ہے۔خود'میں اورمیری کہانیاں' کے عنوان سے آٹھ صفحات پرمشتمل طویل مقدمہ لکھاہے،جس میں انھوں نے کہانی اور کہانی کار کے درمیان کے تخلیقی سفر پرتفصیل سے روشنی ڈالی ہے تاکہ کہانیوں کوسمجھنے میں آسانی ہو۔اسی طرح کتاب کاانتساب بھی انھوں نے کسی بڑی شخصیت سے نہیں کیاہے، بلکہ اسے 'قارئین کے نام' معنون کیاہے۔اس سے لگتاہے کہ انھیں اپنے فن پر پورابھروسہ ہے اوروہ کہانی اورقاری کے درمیان کسی کوحائل نہیں ہونے دیناچاہتیں۔

خوگرِ حمد سے اب تھوڑاسا گلہ بھی سن لیں۔شائستہ کو زبان وبیان پرتھوڑی اورتوجہ دینی چاہئے تھی۔سپاٹ بیانیہ کی وجہ سے کہیں کہیں پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔زبان

مبصر : محمد وصی اللہ حسینی
قیمت : 200 روپئے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔6

ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔6

تھوڑی کھردری ہے اور مقامی لہجہ صاف جھلکتا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں احساس ہوتا ہے کہ کہانی پہلے ہندی میں لکھی گئی ہے پھراردو میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔زبان وبیان اور املے کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔مجموعے کے پہلے افسانے 'بوئے گل نالہ دل' میں لکھا ہے 'گرمجوشی ندارت'۔ یہاں ندارد ہونا چاہئے۔اسی طرح خراماں خراماں کی بجائے خرامہ خرامہ لکھا ہے۔اسی افسانے میں ایک جملہ ہے 'گچھے کے ایک ایک بالوں کو۔۔۔۔ یہاں گچھے کے ایک ایک بال کو۔۔۔۔ ہونا چاہئے۔ایک جگہ لکھا ہے 'خالی نہ صحیح ،مگر بھرے صفحات...اس جملے میں صحیح کی جگہ سہی ہونا چاہئے۔

افسانہ 'خشک پتوں کی موسیقی' میں ایک جملہ ہے 'وہ ایک ٹی وی چینل میں اعلیٰ عہدے پر مقیم تھیں'۔ یہاں مقیم کی جگہ فائز ہونا چاہئے۔ براہ راست اردو میں لکھنے والا معمولی ادیب بھی مذکورہ جملے میں مقیم نہیں لکھ سکتا۔اسی افسانے میں ہے '۵۰۰ ورگ گز میں پھیلا ان کا پشتینی بنگلہ...'اس جملے میں ہندی کا لفظ 'ورگ' غیر مناسب اور بے محل استعمال ہوا ہے۔ورگ کی جگہ مربع لکھنا چاہئے تھا۔ایک اور جملہ ہے 'غیر ملکی صحیح ،مگر تھا تو اپنا'۔ یہاں بھی صحیح کی جگہ سہی ہونا چاہئے تھا۔ اسی طرح افسانہ 'آتشِ زیر پا' میں لکھا ہے 'نکارتی رہی'۔اس کی جگہ انکار کرتی رہی یا منع کرتی رہی ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔اسی افسانے میں ہے 'سنگ سنگ گا رہے ہیں'۔ اگر سنگ سنگ کی بجائے ساتھ ساتھ ہوتا تو کیا برائی تھی؟ افسانہ 'خوابوں کا نیلا سمندر اور تاریک راتیں' میں ایک جگہ ہے 'سناٹی سڑکوں'۔ یہاں سناٹی کی جگہ سنسان ہونا چاہئے تھا ۔اسی افسانے میں ہے 'وقت کی بوریت مٹانے...'وقت کی بوریت کیا ہوتی ہے؟ یہاں صرف بوریت مٹانے ، ہونا چاہئے۔ایک اور جملہ ہے۔'نگاہیں بیک مرر سے جڑی ہوئی تھیں' یہاں جملہ یوں ہونا چاہئے تھا۔'نگاہیں بیک مرر پر مرکوز تھیں'۔افسانہ 'پرآشوب موسم' میں ایک جگہ لکھا ہے 'جنگی سینک' یہاں صرف فوجی ہونا چاہئے۔ افسانہ 'ایک ادھورا سچ' میں دو جگہ 'ساحل کا کنارہ' آیا ہے۔ساحل کے معنی ہی سمندر یا دریا کا کنارہ ہوتا ہے۔پھر ساحل کے ساتھ کنارہ کا استعمال چہ معنی دارد؟ کتاب میں زیادہ تر جگہوں پر تنہا اور آنسو کی جگہ تنہاں اور آنسوں لکھا گیا ہے۔ یہ چند باتیں نمونے کے طور پر پیش کردی گئی ہیں، ورنہ اس طرح کی اور بھی غلطیاں ہیں۔اتنی اہم کتاب میں پروف کی اتنی غلطیاں زیب نہیں دیتیں۔امید کہ شائستہ آئندہ اس جانب توجہ دیں گی۔ اگر وہ اپنے اسلوب کو تھوڑا پرلطف اور خوبصورت بنادیں تو ان کی کہانیوں میں مزید جان پڑ جائے گی۔مجموعی اعتبار سے 'وصف پیغمبری' ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مصنفہ نے تحریک تانیثیت کو ایک نیا وخوبصورت موڑ دیا ہے۔ کتاب کی پیشکش کا انداز بھی اچھا ہے۔امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا۔ میری جانب سے شائستہ فاخری کو نیک خواہشات!

❑❑❑

آپ کے خطوط

'نیا دور' کا مئی اور جون ۲۰۱۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ رسالے کے ظاہری اور باطنی حسن نے آنکھوں کو ٹھنڈی اور دل کو سرور بخشا۔ مئی کے شمارے کی اپنی بات نے اپنی طرف پوری طرح متوجہ کر لیا۔ آپ نے (ایڈیٹر سہیل وحید صاحب) جن راہوں، فکر اور تلاش کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ کی ورق گردانی سے ثبوت بھی فراہم ہو گیا۔ جیسے یہ شمارے عام قاری کے مطالعہ اور تسکین کا باعث ہیں۔ آپ نے ملک کے گوشہ گوشہ اور دوسرے ممالک کے ہر حصہ میں نیا دور کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو پہنچانے کی فکر پیش کی ہے، وہ آج کے قاری کے دل کی آرزو ہے۔ آپ نے 'نیا دور' کو عالمی سطح پر روشناس کرانے کی جو بات کہی ہے، یہ اردو کی بقا کا خوبصورت پہلو ہے۔ آپ کی خواہش، آپ کے حوصلے، لگن، عزم، جستجو اور کوشش آپ کی اردو زبان سے بے پناہ محبت اور لگاؤ کا ثبوت ہے۔ تمام نیک خواہشات کے ساتھ دعائیں بھی ہیں کہ آپ اپنا کام مزید ثابت قدمی کے ساتھ اس میں ضرور کامیاب ہوں گے کہ ملکی اور عالمی سطح پر ایسا لگے کہ 'نیا دور' کا نیا دور ہے۔

نیاز مند

پیکر جعفری اترولوی

شفا منزل، میدان ایل ایچ خان، لکھنؤ

برادرم سہیل

سلام مسنون

خدا کرے بخیر و عافیت ہوں۔۔۔ آمین!

آپ نے از راہ عنایت نیا دور کے جو تین شمارے ارسال کئے ہیں ان کیلئے شکر گزار ہوں۔

نیا دور کو نئے رنگ و روپ میں دیکھ کر خوشی ہوئی اور سب سے زیادہ اس پر خوشی ہوئی کہ آپ واقعی محنت کر رہے ہیں اور یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جو کچھ پیش کیا جائے وہ بامقصد اور مفید ہو۔ میں آپ کی کامیابی کیلئے دعا گو ہوں۔ نیا دور کا ماہ جولائی کا شمارہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ آپ کا اداریہ اور نئے ادیبوں کو پیش کرنے کا طریقہ بھی قابل ذکر ہے۔ کتابوں پر تبصرے کا جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ پُرکشش اور قابل تعریف ہے۔ جولائی کے شمارے میں حمیرا عالیہ کا افسانہ 'آگ کے جگنو' پڑھ کر خوشی ہوئی اور یہ سوچ کر کہ اب بھی نئے لکھنے والے اپنی فکر اور کاوش سے ادب و زبان کو بہت کچھ دینے کیلئے کوشاں ہیں۔ حمیرا کی کہانی اچھی ہے۔ اگر وہ لکھتی رہیں تو نوک و پلک کو سنوارنے کا فن حاصل کر لیں گی۔ ان سے اچھی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ قمر رئیس کے بارے میں ڈاکٹر سلمہ شاہین نے جو لکھا ہے وہ پُرکشش اور مفید ہے۔ پیشکش کا انداز بھی اچھا ہے۔ بحیثیت مجموعی نیا دور کا نیا شمارہ اچھی امیدیں وابستہ کرنے کا باعث ہوگا۔ شکریہ!

آپ کا اپنا

احمد ابراہیم علوی

محترم سہیل وحید!

مدیر، نیا دور، لکھنؤ

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ نیا دور کے دو شمارے مئی اور جون ۲۰۱۷ ایک ساتھ موصول ہوئے۔ زبانی طور پر علم تھا کہ سابق مدیر محترم وضاحت حسین رضوی کی جگہ کوئی سہیل وحید صاحب آئے ہیں۔ ہم سب سنجیدہ لوگ رنجیدہ اور فکر مند تھے کہ اب 'نیا دور' کا کیا ہوگا؟ وضاحت حسین رضوی نے برسوں کی محنت کے بعد اس رسالے کو ایک اچھا ادبی رسالہ بنانے کی جو کوشش کی تھی، کیا وہ رائگاں جائے گی؟ اپنی یہ تشویش اور خدشات میں بذاتِ خود وضاحت حسین رضوی صاحب سے بھی کر چکا تھا (وضاحت صاحب کا تبادلہ، میرٹھ ہو چکا ہے اور وہ شعبہ اردو تشریف بھی لائے تھے)۔ لیکن جب میں نے مئی اور جون کے شمارے دیکھے تو حیرانی بھری خوشی ہوئی۔ نیا دور، ایسا لگتا ہے اپنے نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ رسالے کا گیٹ اپ، سرورق، کمپوزنگ، سٹنگ سے لے کر اس کے مواد میں بھی حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مضامین، افسانے، غزلیں، تبصرے کے ساتھ ساتھ ہندی کہانی کا ترجمہ، ہندوستانی زبانیں کے تحت مراٹھی کہانی، غیر ملکی ادب اور شاہکار تخلیقات کے زمرے میں گذشتہ لکھنؤ کی ایک قسط۔ ہر تخلیق سلیقے سے آراستہ۔ میگزین کو تین کالمی روپ دینا بھی بہتر لگ رہا ہے۔ ایسے میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، وضاحت حسین رضوی کے بعد نیا دور تجربہ کار ہاتھوں میں ہے اور اس رسالے کا نیا دور آ گیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

صدر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

محترمی سلام مسنون

سب سے پہلے تو منصب ایڈیٹر کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ ایک عرصہ کے بعد نیا دور کا دیدار ہوا۔ کافی پہلے میں نیا دور پڑھتا تھا اور کچھ عرصہ سے نیا دور ہم سے اوجھل ہو گیا۔ اچانک مجھے ایک نہیں ۳۔ ۳ ماہ کے نیا دور مئی، جون، جولائی دیکھنے کو ملا۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ واقعی لگ رہا ہے کہ یہ نئے دور کا نیا دور ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کمپیوٹرائز دور میں نیا دور بھی کمپیوٹرائز ہو گیا۔ دوسری بات جو سرورق کا تعین کیا گیا ہے، اس کا جواب نہیں۔ ہر لحاظ سے خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ تقریباً ۲۸ رسال سے نیا دور کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن جو سرورق جون اور جولائی کے دیکھنے کو ملے، اس انداز کے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ اللہ رب العزت آپ کو اور بلندی عطا کرے۔ دعا گو ہوں کہ آپ اس سے بہتر اس کو بنانے کی کوشش کریں گے۔ اور اس نئے دور میں نیا دور کو بلندیوں تک لے جائیں گے۔

آپ کا چھوٹا بھائی

عامر صابری (جرنلسٹ)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی دہلی میں
ایم پی اور سابق مرکزی وزیر جناب مرلی منوہر جوشی سے ملاقات کرتے ہوئے (۲۵/جولائی ۲۰۱۷ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لکھنؤ میں سابق مرکزی وزیر جناب سید شہنواز حسین کے ہمراہ (۱۱/جولائی ۲۰۱۷ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کرگل شہید اسمرتی واٹیکا میں
کرگل جنگ میں شہید ہونے والے سپاہیوں کے اہل خانہ کو اعزاز سے نوازتے ہوئے (۲۶/جولائی ۲۰۱۷ء)

وزیر ریاست برائے اطلاعات ڈاکٹر نیل کنٹھ تیواری وزیر اعلیٰ کی سرکاری رہائش گاہ ۵/کالیداس مارگ پر عوام کے مسائل سنتے ہوئے

वर्ष : 72 अंक 05
अगस्त 2017
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

रजिस्ट्री संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, सुहेल वहीद